تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

ستمبر ۲۰۲۲ء

جلد ۲

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

شمارہ ۱۰

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

ليتفقهوا في الدين

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

ماہ نامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

مجلسِ مشاورت

• حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
• ڈاکٹر محمد رشید ارشد • مفتی اویس پاشا قرنی
• مولانا معراج محمد • مولانا سید اسامہ علی
• مولانا ابرار حسین • مولانا عابد علی بھٹی

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب

مدیر

صوفی جمیل الرحمن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضامین

نعت	حضور ایسا کوئی انتظام ہو جائے	سید صبیح الدین صبیحؔ رحمانی	۴
اداریہ	توبہ اور خدمت	مدیر	۶
درسِ قرآن	جذبۂ ایثار: اسلامی معاشرے کی اہم خصوصیت	مولانا محمد اقبال	۱۱
درسِ حدیث	المسلم اخو المسلم	ابنِ عباس	۱۵
مقالات	کتابوں کی خریداری سے آتی ہے مال داری	مفتی ثنار احمد مصباحی	۱۷
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۵)	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۲۰
مقالات	اسکول بحیثیت ادارہ	فرید بن مسعود	۲۵
مقالات	سفرنامۂ ترکی (۸)	مولانا حماد احمد ترک	۲۷
سلوشن	راشن مہم وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم دینا	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۳۳
ادبیات	ادھوری جدیدیت (۱)	سلیم احمد	۳۵
رحلات	افغان نامہ (۲)	مفتی اویس پاشا قرنی	۴۱

سید صبیح الدین صبیح رحمانی
معروف نعت گو شاعر

حضور ایسا کوئی انتظام ہو جائے

حضور ایسا کوئی انتظام ہو جائے
سلام کے لیے حاضر غلام ہو جائے

میں صرف دیکھ لوں اک بار صبحِ طیبہ کو
بلا سے پھر مری دنیا میں شام ہو جائے

تجلیات سے بھر لوں میں کاسۂ جاں
کبھی جو ان کی گلی میں قیام ہو جائے

حضور آپ جو سن لیں تو بات بن جائے
حضور آپ جو کہہ دیں تو کام ہو جائے

حضور آپ جو چاہیں تو کچھ نہیں مشکل
سمٹ کے فاصلہ یہ چند گام ہو جائے

ملے مجھے بھی زبانِ بوصیریؒ و جامیؒ
مرا کلام بھی مقبولِ عام ہو جائے

مزہ تو جب ہے فرشتے یہ قبر میں کہہ دیں
صبیحؔ! مدحت خیر الانام ہو جائے

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

* * * * *

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

توبہ اور خدمت

قرآنِ کریم میں ایک قوم کا ذکر کیا گیا کہ جب انھوں نے آسمان پر بادل کو دیکھا تو خوشی سے کہنے لگے: ﴿هَذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ ”یہ ہم پر مینھ برسائے گا“ لیکن جب وہ بدلی نزدیک آئی تو حالات بدل گئے اور پتا چلا کہ اس بدلی میں تو دراصل عذابِ الٰہی پوشیدہ تھا۔ تو ہمارا حال اس قوم سے کوئی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ہم بارشوں کے محتاج لوگ، بھیگے ساون کی بارشوں کے کتنی شدت سے منتظر تھے لیکن ”کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا سیلاب بھی ساتھ“ تو ساون، سیلِ بے اماں کو ساتھ لے آیا، چھوٹے چھوٹے ندی نالے ایسے بپھرے کہ ہمارے پیارے بلوچوں کو بلو کر رکھ دیا۔ پنجاب، واقعی ”پنج آب“ بن گیا اور سالوں کے سوئے دریاؤں کے سوتے بہہ نکلے اور پنج آب، زیرِ آب آگیا۔ شریف اور تابع فرمان سندھ کی بدحالی پر آسمان ایسا ٹوٹ کر رویا کہ اس کے اشکوں میں پورا سندھ بہہ نکلا، چناں چہ ”زیادہ بارش ہوئی اور زیادہ پانی آیا“ اور زیرِ عتاب سندھ غرقاب ہوگیا۔ نتیجہ یہ کہ لوگوں کے مکان ٹوٹ گئے یا ڈوب گئے۔ فصلیں تباہ، باغ ویران اور جانور برباد ہوگئے۔ گھروں کا سامان کچھ بچ پایا اور کچھ غرق رہا۔ راشن اور اشیاے خور و نوش ناپید ہوگئیں۔ چادر اور چار دیواری پہلے کون سی تھی؟ رہی سہی بھی گئی۔ ذرائع آمد و رفت معطل ہوگئے۔ خشکی کے راستے چاہے پیدل ہوں یا سوار، مسدود ہوگئے۔ قصہ مختصر یہ کہ انسانیت سانحے سے دوچار ہوگئی۔ مادی سطح پر سیلاب کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ہم نے کالا باغ ڈیم نہیں بنایا یا انڈیا نے اضافی پانی کھول دیا وغیرہ وغیرہ لیکن اس کی حقیقی وجہ مادی نہیں بلکہ اخلاقی ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ کی اطاعت میں پیچھے رہ گئے ہیں ورنہ بارشیں ہمیں نقصان نہ پہنچاتیں۔ ایک حدیثِ قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: «لَوْ أَنَّ عبيدِي أَطَاعُونِي

لَأَسْقَيْتُهُمُ الْمَطَرَ بِاللَّيْلِ وَأَطْلَعْتُ عَلَيْهِمُ الشَّمْسَ بِالنَّهَارِ وَلَمَا أَسْمَعْتُهُمْ صَوْتَ الرَّعْدِ»(مسند احمد)''اگر میرے بندے (ٹھیک سے) میری اطاعت کریں تو میں انھیں راتوں میں بارش سے سیراب کردوں اور دن کو مطلع صاف کر دوں یہاں تک کہ ان پر سورج طلوع ہو جائے اور میں انھیں بادلوں کے کڑکے تک نہ سننے دوں''۔ تو ہمارا اجتماعی اور اکثریتی رویہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ اور اس سب سے بڑھ کر ہمارا ''سرکاری'' رویہ سراسر مبنی بر معصیت ہے۔ ایک عام شخص کوئی ناچ گانا دیکھ لے تو بھی یقیناً بری بات ہے لیکن ملک کے ''شُرَفا'' شاہ باز شریفِ اعظم کی سرکردگی میں ناچ اور ڈانس ملاحظہ فرمائیں اور قرآنی آیت ﴿تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ﴾ کے مصداق جس میں قومِ لوط کو کہا گیا کہ ''تم اپنی بھری مجلس میں بدی کا ارتکاب کرتے ہو'' وطنِ عزیز کے سب سے بڑے دن کی سب سے بڑی مجلس میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر عورتوں کا رقص دیکھیں۔ وہ دن جس میں آزادی کا سورج طلوع ہوا اس لائق تھا کہ سر سجدے سے نہ اٹھایا جاتا لیکن سرکشی کو شعار بنایا گیا، وہ دن جو اس لائق تھا کہ شکر و حمد کے ترانے الاپے جاتے اس میں شیطانی آلات اور ساز و راگ پر سر دھنا گیا، تو کیا معلوم اسی کی سزا سے پاکستان کو نوازا گیا۔ بہرحال؛ اب کرنے کا پہلا کام توبہ و استغفار ہے۔ یہی توبہ ہے جس نے قومِ یونس علیہ السلام پر سے عذاب کو ٹال دیا تھا اور قرآنِ کریم میں بتلایا گیا عام اصول بھی یہی ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (الانفال:۳۳) ''اور اللہ انھیں عذاب دینے والا نہیں ہے جب تک وہ استغفار کرتے رہیں'' اجتماعی حالات میں انفرادی معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ اس باب میں احادیث بہت کثرت سے منقول ہیں جن کے مطابق بعض افراد کو اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہوتی ہے۔ بعض کے گناہ معاف ہوتے ہیں تو بعض کے درجات بلند ہوتے ہیں اور پانی میں ڈوب کر مرنے والوں کو رسول اللہ ﷺ نے شہادت کی بشارت بھی تو دی ہے۔ پس ہم دعا گو ہیں کہ سیلاب زدگان میں سے جو غرقاب ہوئے انھیں شہادت کا رتبہ عطا کیا جائے اور آزمائشوں میں مبتلا لوگوں کے گناہ معاف کر کے ان کے درجات بلند کیے جائیں۔ یہ تو آخرت کے حوالے سے بات ہوئی لیکن دنیا میں بہرحال اس سیلاب نے سب کچھ اتھل پتھل کر دیا۔ دھرتی ماں کو اپنے خون پسینے سے سینچ کر، اپنے پلے جانوروں کی لسی پی اور اپنی گندم کی روٹی کھا کر اپنے جھونپڑے کے سکون کے مزے لینے والا کسان حقیقت میں ایک نواب کی سی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن اب حال یہ ہے کہ:

اب گھاٹ نہ گھر دہلیز نہ در اب پاس رہا ہے کیا بابا
بس تن کی گٹھری باقی ہے جا یہ بھی تو لے جا بابا
ہم بستی چھوڑے جاتے ہیں تو اپنا قرض چکا بابا

ایک طرف لوگ بھوک و پیاس میں مبتلا ہیں اور دوسری طرف ہم کچھ لوگ ہیں جو کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، پہن رہے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انھیں کھلایا، پلایا، پہنایا ہے ورنہ تھے تو ہم بھی سارے بھوکے ننگے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:«يَا عِبَادِي كُلُّكُمْ جَائِعٌ إِلَّا مَنْ أَطْعَمْتُهُ فَاسْتَطْعِمُونِي أُطْعِمْكُمْ يَا عِبَادِي كُلُّكُمْ عَارٍ إِلَّا مَنْ كَسَوْتُهُ فَاسْتَكْسُونِي أَكْسُكُمْ» ”اے میرے بندو تم سب کے سب بھوکے ہو سوائے جسے میں کچھ کھلا دوں پس مجھ ہی سے کھانا طلب کرو میں تمھیں کھلاؤں گا، اے میرے بندو تم سب کے سب ننگے ہو سوائے جسے میں پہنا دوں پس مجھ سے لباس طلب کرو میں تمھیں پہناؤں گا“ اللہ تعالیٰ سے کھانا طلب کرنے اور اس سے لباس طلب کرنے کا ایک تو مشہور و معروف طریقہ ہے اور وہ ہے دعا اور ایک دوسرا طریقہ بھی ہے اور وہ ہے دوسروں کی خوراک، ان کی پوشاک، ان کی چھت کی فکر کرنا اور ان کی ضروریات کا اہتمام کرنا، یہ ”آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام“ والا طریقہ ہے۔ اخروی اجر و ثواب الگ اور دنیا کا فائدہ الگ۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی خبر دی اور فرمایا:«وَاللهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ»(صحیح مسلم) ”اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد میں لگا رہے“۔«مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللهُ فِي حَاجَتِهِ»(صحیح مسلم) ”جو اپنے مسلمان بھائی کی ضروریات پوری کرنے پر لگ جائے، اللہ اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو جاتا ہے“۔ یہ تو ہوا خدمتِ خلق کا دنیاوی فائدہ لیکن اس سے بڑھ کر بشارت یہ ہے کہ خدمت سے اللہ کی محبت ملتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ کون سے لوگ اور کون سے اعمال اللہ کو محبوب ہیں؟ تو فرمایا:«أَحَبُّ النَّاسِ إلى اللهِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ وأَحَبُّ الأعْمَالِ إِلَى الله عَزَّ وجَلَّ سُرُورٌ تُدْخِلُهُ على مُسْلِمٍ يَكْشِفُ عَنْهُ كُرْبَةً أَوْ يَقْضِي عَنْهُ دَيْنًا أَوْ يَطْرُدُ عَنْهُ جُوعًا»(صحیح الترغیب والترہیب) ”اللہ کے نزدیک محبوب ترین

لوگ وہ ہیں جو لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہیں اور اللہ کے نزدیک محبوب اعمال میں سے یہ ہے کہ تم کسی مسلمان کو خوش کر دو اس کی کوئی تکلیف دور کر دو، اس کا کوئی قرض ادا کر دو یا اس کی بھوک مٹانے کے لیے کھانے کا انتظام کر دو"۔ اس مبارک عمل کا اخروی اجر و ثواب بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ أَعَانَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ عَلَى حَاجَةٍ حَتَّى يُثْبِتَهَا لَهُ ثَبَّتَ اللهُ قَدَمَيْهِ يَوْمَ تَزُولُ الْأَقْدَامِ» (صحیح الترغیب والترہیب) "جس نے کسی مسلمان کی مدد کی یہاں تک کہ اس کی حاجت پوری کر دی اللہ اسے قیامت کے دن ثابت قدم رکھے گا جب کہ عام طور پر اس دن قدم ڈگمگا رہے ہوں گے"۔

اگر کوئی باوجود استطاعت کے مسلمان بھائیوں کی خدمت نہ کرے تو بات اتنی ہی نہیں ہے کہ مندرجہ بالا اجر و ثواب اور فضیلتوں سے محروم ہو جائے بلکہ ایسے افراد کو اخروی جواب دہی کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ ایک حدیثِ مبارکہ میں قیامت کے دن کے کچھ سوال و جواب نقل کیے گئے ہیں۔ اس میں یہ سوال بھی ہے کہ اللہ پوچھے گا: «يَا ابْنَ آدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي» "اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھلایا نہیں بندہ کہے گا اے میرے رب میں تجھے کیسے کھلاتا جبکہ تو رب العالمین ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو جانتا نہیں کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا تھا اگر تو اسے کھلاتا تو تو اسے میرے پاس پاتا پھر اللہ کہے گا: «يَا ابْنَ آدَمَ اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِي» "اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے مجھے پلایا نہیں بندہ کہے گا اے میرے رب میں تجھے کیسے پلاتا جبکہ تو تمام جہانوں کا رب ہے اللہ کہے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تو نے اسے نہیں پلایا تھا اگر تو اسے پلاتا تو تو اسے میرے پاس پاتا"۔ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہمارے مالوں میں محتاجوں اور ضرورت مندوں کا حصہ رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ﴿٢٤﴾لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴿٢٥﴾ (المعارج: ۲۴، ۲۵) "اور وہ (نیک لوگ) جن کے مالوں میں ایک معلوم حق رکھا گیا ہے سائل کے لیے اور محتاج کے لیے"۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حق کو مؤکد کرتے ہوئے فرمایا: «إِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ» (سنن ترمذی) "بے شک مال میں زکاۃ کے علاوہ بھی حق ہے"۔ اب آخری بات یہ جان لینی چاہیے کہ اگر کوئی یہ حق ادا نہ کرے تو اللہ مالوں میں رکھا گیا محتاجوں کا حصہ چھین بھی لیتا

ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:«إِنَّ للهِ أَقْوَامًا اخْتَصَّهُمْ بِالنِّعَمِ لِمَنَافِعِ العِبَادِ يُقِرُّهُمْ فِيهَا مَا يَبْذُلُونَهَا فَإِذَا مَنَعُوهَا نَزَعَهَا مِنْهُمْ فَحَوَّلَهَا إِلَى غَيْرِهِمْ»(صحیح الترغیب والترہیب)''بے شک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنھیں اللہ نے لوگوں کے نفع کی خاطر اپنی نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ یہ بندے جب تک اپنے مال و دولت (ضرورت مند) لوگوں پر خرچ کرتے رہتے ہیں اللہ ان کی نعمتوں کو برقرار رکھتا ہے اور جب یہ لوگوں کو دینے سے رک جاتے ہیں تو اللہ اِن سے اپنی نعمتیں چھین کر دوسرے بندوں کی طرف منتقل کر دیتا ہے''۔

اب ہم سیلاب سے بڑی مصیبت کی طرف آتے ہیں جس میں ہم اس وقت مبتلا ہیں۔ یہ سیلاب کوئی اتنی بڑی مصیبت نہیں اس لیے کہ یہ جتنا بھی زور مارے اور جتنوں کو مارے، میرے نبی ﷺ کی دعا کے مطابق امت ختم ہونے والی نہیں۔ سیلاب سے بڑی مصیبت جس میں ہم مبتلا ہیں جس نے ہماری قوم کو سیلِ رواں کے بجائے غُثاء السیل (سیلاب کی جھاگ اور خس و خاشاک) بنا دیا وہ باہمی سر پھُٹّوَل ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے لیے مانگی گئی ایک دعا کے بارے میں یوں بتاتے ہیں:«وَسَأَلْتُهُ أَنْ لَا يُهْلِكَهُمْ غَرَقًا فَأَعْطَانِيهَا وَسَأَلْتُهُ أَنْ لَا يَجْعَلَ بَأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ فَرَدَّهَا عَلَيَّ»''میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ میری (کل کی کل) امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے تو اللہ نے میری دعا قبول کر لی اور میں نے رب سے سوال کیا کہ ان کی باہم لڑائی نہ ہو لیکن یہ دعا منظور نہیں کی گئی''(سنن ابنِ ماجہ) اب اس تفرقہ باہمی اور کھینچا تانی کا بڑا ظہور سیاسی میدان میں ہے کہ معاشی عدمِ استحکام سمیت بہت سارے مسائل کی جڑ یہی ہے اور بڑی مصیبت یہ کہ اصحابِ حکومت (حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف) سیلاب زدگان کی طرف گویا متوجہ ہی نہیں ہیں۔ تو ان لوگوں کو چاہیے کہ اس دھرتی کو تھوڑا سا سکون لینے دیں اور عوام کی خدمت کی طرف متوجہ ہوں۔

*****

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

جذبۂ ایثار: اسلامی معاشرے کی اہم خصوصیت

سورۃ الحشر، آیت:۹

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالإِيمَانَ مِن قَبلِهِم يُحِبُّونَ مَن هَاجَرَ إِلَيهِم وَلَايَجِدُونَ فِي صُدُورِهِم حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا، وَيُؤثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِم وَلَو كَانَ بِهِم خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفسِه فَأُولَٰئِكَ هُمُ المُفلِحُونَ﴾

''وہ لوگ جو پہلے ہی سے اس جگہ (یعنی مدینہ میں) ایمان کے ساتھ مقیم ہیں۔ جو کوئی ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے یہ اس سے محبت کرتے ہیں، اور جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے، یہ اپنے سینوں میں اس کی کوئی خواہش بھی محسوس نہیں کرتے، اور ان کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے ان پر تنگ دستی کی حالت گزر رہی ہو۔ اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو جائیں، وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں''۔

آیت کا پس منظر

صحیح بخاری میں اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھوک کی حالت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے انھیں ازواجِ مطہرات کے یہاں بھیجا، تاکہ ان کو کھانا کھلا دیں۔ ازواجِ مطہرات نے اطلاع دی کہ ہمارے پاس گھروں میں پانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس موقعے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان صاحب کی مہمان نوازی کون کرے گا؟ ایک انصاری صحابی (حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ) کہنے

لگے کہ میں کروں گا۔ چنانچہ وہ اس شخص کو اپنے گھر لے گئے اور اپنی اہلیہ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے مہمان کی خاطر تواضع کریں۔ ان کی اہلیہ نے کہا کہ گھر میں بچوں کے کھانے کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا جو کچھ بھی ہے اسے نکال دو اور چراغ جلا لو اور بچے اگر کھانا مانگتے ہیں تو انھیں سلائیں۔ چنانچہ ان کی اہلیہ نے کھانا نکال دیا اور چراغ جلا دیا اور اپنے بچوں کو بھوکا سلا دیا۔ پھر وہ ظاہر تو یہ کر رہی تھیں جیسے چراغ درست کر رہی ہوں، لیکن انھوں نے اسے بجھا دیا۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی مہمان کے سامنے یہ تاثر دینے لگے کہ گویا وہ بھی ان کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں، لیکن ان دونوں نے اپنے بچوں سمیت رات فاقے سے گزار دی۔ جب صبح ہوئی اور وہ صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں میاں بیوی کے نیک عمل پر رات کو اللہ تعالیٰ ہنس پڑا یا یہ فرمایا کہ اسے پسند کیا۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلٰى أَنفُسِهِم وَلَو كَانَ بِهِم خَصَاصَةٌ وَمَن يُّوقَ شُحَّ نَفسِهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ المُفلِحُونَ﴾ ”یہ لوگ ان کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے ان پر تنگ دستی کی حالت گزر رہی ہو۔ اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو جائیں، وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں“۔

تفسیر و توضیح

یہ آیت اگرچہ ایک خاص واقعے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کی مہمان نوازی کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے، مگر اس میں انصارِ مدینہ کے ایثار کی عمومی توصیف و تعریف بیان فرمائی گئی ہے کہ انصاری صحابہ جو مدینہ منورہ کے اصل باشندے ہیں، انھوں نے دل کھول کر مہاجرین صحابہ کی مدد کی۔ چنانچہ ان کی اس ایثار و قربانی کے متعلق فرمایا:

﴿يُحِبُّونَ مَن هَاجَرَ إِلَيهِم، وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِم حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا﴾ ”جو کوئی ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے یہ اس سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے، یہ اپنے سینوں میں اس کی کوئی خواہش بھی محسوس نہیں کرتے“۔ یعنی انصارِ مدینہ نے مکہ سے آنے والے مہاجرین کو کھلے دل سے اپنے وطن میں خوش آمدید کہا۔ انھیں اپنی معیشت پر بوجھ نہیں سمجھا اس کے باوجود کہ وہ ناداری و محرومی کی حالت میں یہاں آئے۔ اپنے وطن سے ہجرت کرنے والے

عموماً مجبوری کی بنا پر وطن چھوڑتے ہیں، جب یہ مہاجرین کسی علاقے سے ہجرت کر کے آتے ہیں تو یہ اپنے ساتھ مال و متاع نہیں لاسکتے اس لیے یہ نادار ہوتے ہیں اور نادار و تنگ دست علاقے کی معیشت پر بوجھ بن جاتے ہیں۔

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ "اور ان کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے ان پر تنگ دستی کی حالت گزر رہی ہو"۔ آیت کے اس حصے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ انصارِ مدینہ نے نہ صرف یہ کہ ان مہاجرین کو اپنے وطن میں خوش آمدید کہا بلکہ ہر مشکل حالت میں ان مہمان مہاجرین کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر بھی ترجیح دی۔ انصارِ مدینہ میں سے سب لوگ امیر و دولت مند نہیں تھے، بہت سے لوگ نادار اور تنگ دست بھی تھے، لیکن انھوں نے بھی اپنی ضروریات کو پسِ پشت ڈال کر اپنے مہاجر بھائیوں کی بھرپور مدد کی تھی۔ چنانچہ اس کی ایک مثال حضرت ابوطلحہ اور ان کی اہلیہ رضی اللہ عنہما کی ہے کہ جن کے اسی جذبۂ ایثار کے اعتراف میں یہ آیت نازل ہوئی کہ انھوں نے خود کو اور اپنے بچوں کو بھوکا رکھا مگر اپنے مہمان کی بھوک برداشت نہیں کر سکے۔ اور سارے انصار کی یہی کیفیت تھی کہ وہ ایثار سے کام لیتے تھے۔

﴿وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ "اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو جائیں، وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں"۔ یعنی کامیاب لوگ در حقیقت وہی ہیں جو ملکۂ بخل سے نجات حاصل کریں۔ بخل کی طبیعت سے نجات والے کون ہیں؟ ان کے متعلق مفسرین فرماتے ہیں کہ "ہر وہ شخص بخل کے ملکے سے پاک ہے جو ایسے مال کے حصول سے بچتا ہے، جس کے لینے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اور ایسا مال اپنے پاس محفوظ نہیں رکھتا، جس کی ادائیگی کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے"۔ (زاد المسير في علم التفسير، ج:۴، ص:۲۵۹) اس آیتِ مبارکہ میں جہاں انصارِ مدینہ کو اس وصف کی بدولت کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے وہاں ہر وہ شخص جو اس اہم اور عظیم وصف میں ان کے ساتھ ہو وہ بھی مذکورہ کامیاب لوگوں کی فہرست میں آتا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ہزار

دینار لے کر آئے، جس وقت حضور ﷺ ''جیشِ عسرہ'' کی تیاری میں مصروف تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ دینار آپ کی گود مبارک میں ڈال دیے۔ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو دیکھا کہ وہ ان دیناروں کو اپنی گود میں الٹتے پلٹتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ آج کے بعد عثمان کا کوئی بھی عمل انھیں نقصان نہیں پہنچائے گا، ایسا آپ ﷺ نے دو بار فرمایا۔(سننِ ترمذی) حاصلِ کلام یہ ہے کہ ایثار یعنی اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دینا اسلامی معاشرے کی امتیازی خصوصیت ہے۔ جس طرح تعلیماتِ اسلام نے جذبۂ ایثار کی اہمیت و فضیلت بیان کی ہے اس کی نظیر دوسرے ادیان واقوام کے ہاں ملنی مشکل ہے۔ اسلام نے صرف تعلیم ہی نہیں دی بلکہ مسلم قوم نے اس کی زندہ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ہر زمانے میں ایسے خوش قسمت رہے ہیں جنھوں نے اپنی ضروریات پر دوسرے لوگوں کی ضروریات کو مقدم رکھا ہے۔ خاص طور پر ایثار کا یہ جذبہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی میں ہم بخوبی مشاہدہ کر سکتے ہیں، انھوں نے ہمیشہ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کیا اور اپنی ضروریات کے مقابلے میں دوسروں کو خود پر ترجیح دی۔ آج کل ہمارے وطن کے مختلف حصوں میں سیلابی صورتِ حال درپیش ہے اور اس نے پہلے ہی سے مفلوک الحال لوگوں کی مصیبت میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ ایسے میں ایثار کے اسی جذبے کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جو مطلوب ہے اور جسے اسلامی تعلیمات کی نظر میں حقیقی کامیابی قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مذکورہ آیتِ مبارکہ کا کامل مصداق بنائیں اور ہمیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

*****

ابنِ عباس
معاون قلم کار

المسلم اخو المسلم

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَحْقِرُهُ وَحَسْبُ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ» (مسند احمد)

"سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسلمان؛ مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے (کسی خراب صورتِ حال میں) تنہا چھوڑتا ہے اور نہ ہی اسے حقیر سمجھتا ہے۔ اور بندے کے برے ہونے کی یہی نشانی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے"۔

تشریح

قرآنِ پاک میں اہلِ ایمان کو باہم بھائی قرار دیا گیا: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (الحجرات:۱۰) "بے شک اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔ حدیث مندرجہ بالا گویا اسی فرمانِ خداوندی کی تفصیل ہے جس میں ایمانی اخوت کے چند مظاہر بیان ہوئے ہیں۔ ظلم کی حرمت: ایمانی اخوت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ایک مسلمان بھائی دوسرے پر کوئی ظلم و زیادتی نہ کرے۔ سنن ترمذی کی ایک حدیث میں آتا ہے: «كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، عِرْضُهُ وَمَالُهُ وَدَمُهُ» "ہر مسلمان کی عزت، اس کا مال اور اس کی جان دوسرے مسلمان پر محترم ہے"۔

خذلان کی حرمت: امام ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ نے خذلان کی تعریف میں لکھا ہے: تَرْكُ النُّصْرَةِ وَالْإِعَانَةِ "اس کی

نصرت اور اعانت کو ترک کرنا، ایک حدیث میں اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں آئی ہے:«وَلَا يَنْسَاهُ فِي مُصِيبَةٍ نَزَلَتْ بِهِ» ”مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو اس کی مصیبت کے وقت میں نہیں بھولتا“ ایک حدیث میں فرمایا گیا:«مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ، وَتَرَاحُمِهِمْ، وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى»(صحیح مسلم) ”باہمی محبت ورحمت اور لطف ومہربانی میں اہلِ ایمان کی مثال ایک جسم کی طرح ہے کہ جسم کے کسی ایک حصے میں تکلیف ہو توبقیہ سارا جسم بھی بے چینی و درد اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے“۔

حقارت کی ممانعت: حقارت کا مطلب ہے کسی کو نا قابلِ التفات، خود سے کم تر اور گھٹیا سمجھنا، اس کی برائی اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ اسے بندے کے برے ہونے کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھنے سے تکبر کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے جو رائی کے دانے کے برابر بھی پایا جائے تو جنت میں داخلہ ممنوع ہو سکتا ہے۔ حدیث زیرِ مطالعہ میں جو دوسرے ممنوع امور ہیں مثلاً خذلان اور ظلم وہ بھی اکثر و بیشتر حقارت ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان جس کو حقیر سمجھتا ہے نہ تو اسکی مدد کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ عدل وانصاف کر سکتا ہے۔

*****

تحریر: مفتی نثار احمد مصباحی

انتخاب: محمد عثمان خان

کتابوں کی خریداری سے آتی ہے مال داری

ہمارے محقق علما اور قابلِ قدر علمی کام کرنے والے مصنفین ہماری جماعت کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ ہم ان کی محنتوں کی قدر کریں۔ وہ شب و روز کی جاں گسل محنت کے بعد کوئی علمی اور تحقیقی کتاب تیار کرتے ہیں اور کسی طرح پیسوں کا انتظام کرکے اسے چھپواتے اور منظرِ عام پر لاتے ہیں اور ہم جیسے ناکارہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ کتاب مفت میں ہمیں مل جائے تاکہ ہم لائبریری یا الماری کی زینت بنا کر رکھ سکیں۔ ہمیں یہ رویّہ بدلنا ہوگا۔ کتاب خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔

جو کتابیں دسترس میں ہیں یا جنھیں ہم بآسانی خرید سکتے ہیں ان کی پی ڈی ایف طلب کرنے کے بجائے ان پر پیسہ خرچ کرکے انھیں پڑھنا چاہیے۔ تاکہ کتاب کی برکت بھی ملے، مصنفین کی محنت کی قدر بھی ہو، اور دینی کتب کے ناشرین کی روز بروز خستہ ہوتی حالت بھی کچھ سنبھل سکے۔

خاکسار کو اپنی حیثیت کے مطابق کتابیں خرید کر پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً خریدتا بھی رہتا ہے۔ یہ محض اس لیے بتا اور لکھ رہا ہوں تاکہ جو لوگ استطاعت کے باوجود کتابیں نہیں خریدتے انھیں کچھ ترغیب دے سکوں۔

شیخ نور الدین عتر حلبی (وفات: ۶ صفر ۱۴۴۲ھ) معاصر شامی علما و محدثین میں اپنے علم و عمل اور تصنیفات و تحقیقات کی بنیاد پر ایک منفرد عظمت و اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ ان کا بہت مشہور قول ہے: شِرَاءُ الکُتُبِ یُورِثُ الغِنی (کتابیں خریدنے سے مالداری آتی ہے۔) یہ بات بزرگوں کے مجربات میں سے ہے۔

علامہ محمود بن سعید مقدیش صفاقسی تونسی (وفات: ۱۲۲۸ھ) نے اپنی کتاب نزهة الأنظار في عجائب التواريخ

و الأخبار کے خاتمے میں شیخ ابو عبد اللہ محمد الغراب (وفات:۱۳۵ھ) کے احوال میں لکھا ہے کہ ان کے والد ایک تاجر تھے۔ ایک بار انھیں ڈھیر سارا مال دیا اور کہا جاؤ حج کر آؤ۔ اور بچے ہوئے پیسے سے (واپسی میں مصر سے) مالِ تجارت خریدتے آنا۔ (تاکہ انھیں بیچ کر نفع حاصل کیا جا سکے۔) شیخ ابو عبد اللہ حج سے واپسی پر جب مصر پہنچے تو بچے ہوئے سارے پیسے کی کتابیں خرید کر اپنے ساز و سامان کے ساتھ بھر لیں۔!!! جب گھر پہنچے تو ان کے والد نے سمجھا یہ سب مال تجارت ہے، مگر جب اتارا گیا تو کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا_ ان کے والد نے کہا: بیٹے! مالِ تجارت کہاں ہے؟ شیخ ابو عبد اللہ نے فرمایا: یہ کتابیں ہی میری تجارت ہیں (یعنی تجارتِ اخروی)۔ ان کے والد غضبناک ہو گئے اور بولے کہ تو نے میرا سارا مال برباد کر دیا اور مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ شیخ ابو عبد اللہ نے اپنے شیخ سے ماجرا عرض کیا تو ان کے شیخ نے ان کے والد کو بلوایا اور فرمایا: لَمَ غضبتَ من التجارة الرابحة الباقية؟ طيب قلبك، و أبشر بالغنى فإن شراء الكتب يورث الغنى فهذه تجارة الآخرة حصلت، و يعوضك الله بتجارة الدنيا یعنی (تجارتِ فانیہ کے بجاے) نفع بخش تجارتِ باقیہ (تجارتِ اخروی) کر لینے پر آپ ناراض کیوں ہو گئے؟ اطمینان رکھیں۔ اور مالداری کی بشارت لیں۔ کیوں کہ کتابوں کی خریداری، خوش حالی و مال داری لاتی ہے۔ (یہ جو آپ کے لڑکے نے کیا) یہ تجارتِ اُخروی ہوئی، اور اس کے عوض میں اللہ عز و جل آپ کو تجارتِ دنیوی عطا فرمائے گا۔

پھر شیخ نے ان کے لیے اور ان کی نسل کے لیے حفاظت و برکت کی دعا کی۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور آگے چل کر دنیوی کاروبار میں بہت نفع ہوا اور انھیں ڈھیر ساری دولت ملی۔!!! شیخ محمود مقدیش بتاتے ہیں کہ: وہ کتابیں آج تک (تیرھویں صدی کے پہلی چوتھائی تک) محفوظ و موجود ہیں اور لوگ ان کتابوں سے آج تک (دینی و علمی) نفع پا رہے ہیں۔ محمود سعید مقدیش الصفاقسی: نزهة الأنظار في عجائب التواريخ و الأخبار، ج ۲، ص ۳۷۰، ۳۷۱۔ دار الغرب الاسلامی، بیروت، طبع اول ۱۹۸۸ء

حدیث شریف میں روزے کے بارے میں آیا ہے: صوموا تصحوا (روزہ رکھو صحت مند ہو جاؤ گے)، اور حج کے

بارے میں آیا ہے: حجوا تستغنوا (حج کرو مال دار ہو جاؤ گے) علما فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحت کے لیے روزہ رکھے یا مال کے حصول کے لیے حج کرے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان خالص رضائے الٰہی کے لیے روزہ و حج کرے۔ اور پھر اسے روزے کی برکت سے صحت، اور حج کی برکت سے دولت نصیب ہوگی۔ اسی طرح بزرگوں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر جو یہ فرمایا ہے کہ کتابیں خریدنے سے مال داری آتی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ محض مالدار و خوش حال بننے کی نیت سے آدمی کتابیں خریدتا رہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حصولِ علم، نشرِ علم، نفعِ عباد، اور تجارتِ اُخروی کی نیت سے بندہ دینی کتابیں خریدے تو اس کی برکت سے اللہ عزوجل دولتِ دنیوی بھی عطا فرماتا ہے اور تجارت و رزق میں برکاتِ الٰہی کا ظہور ہوتا ہے!!!

لہٰذا دینی کتابیں خریدیں، پڑھیں، اور اپنے وارثین کے لیے دنیوی وراثت کے ساتھ ایک بہتر اور نفعِ اخروی والی وراثت بھی چھوڑ کر جائیں۔

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۵)

۶۴۲ھ میں بیت المقدس، غزہ اور ساحلی علاقے، صلیبی قبضے سے آزاد کرانے کے بعد الملک الصالح نجم الدین ایوب تین سال شام ہی میں مقیم رہے۔ انھوں نے بیت المقدس اور یہاں کی عوام پر کثیر مال خرچ کیا اور شہر کی تعمیرِ نو بھی کرائی۔ ۶۴۵ھ میں انھوں نے بیت المقدس کی الوداعی زیارت کی اور مصر کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا۔ طبریہ اور عسقلان بدستور فرنگی قبضے میں تھے۔ واپسی کے سفر کے دوران انھوں نے ان دونوں شہروں پر حملہ کر کے انھیں آزاد کرایا۔ ۶۴۶ھ میں نجم الدین ایوب مصر لوٹ آئے۔ آئندہ کچھ عرصے وہ مختلف ایوبی حکمرانوں سے برسرِ پیکار رہے۔ (تاریخ ابنِ کثیر) ۶۴۷ھ میں فرنگیوں نے دمیاط پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور یہاں کے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ سلطان نجم الدین ایوب فوج لے کر یہاں روانہ ہوئے لیکن راستے میں ان کی بیماری شدت پکڑ گئی، منصورہ میں آپ کا انتقال ہوا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے ان کے انتقال کی خبر کو چھپایا اور اپنے بیٹے الملک المعظم توران شاہ کو دوسرے علاقے سے بلایا۔ ان کے آنے پر بادشاہ کے انتقال کی خبر نشر کی گئی اور توران شاہ کو بادشاہ بنایا گیا۔

توران شاہ فوج لے کر دمیاط روانہ ہوئے اور ماہِ محرم ۶۴۸ (۱۲۵۰ء) کو پہلے معرکۂ منصورہ میں اور پھر معرکۂ فارسکور میں فرنگیوں کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ شاہ فرانس لوئیس نہم اس جنگ میں قیدی بنایا گیا جو فدیہ دے کر آزاد ہوا۔ البتہ تھوڑی مدت بعد الملک المعظم توران شاہ کو ان کے امرا نے ایک سازش کے تحت قتل کر دیا۔ اس کے بعد ان کے والد کے ایک مملوک عزالدین ایبک ترکمانی کو حکمران بنایا گیا۔ اس طرح سلطنتِ ممالیک کی داغ بیل پڑی۔ جس سے مملوک

سلطنت اور ایوبی حکمرانوں کی باہم چپقلش شروع ہوئی۔ کئی ایک لڑائیاں بھی ہوئیں۔ فرانس کے بادشاہ لوئیس نہم کی فوجیں عکا میں موجود تھیں۔ پہلے تو ایوبیوں نے اس شرط پر فرنگیوں سے اتحاد کرنے کی کوشش کی کہ فتح کے بعد بیت المقدس فرنگیوں کو دے دیا جائے گا لیکن مملوکوں نے فرنگیوں کو اس اتحاد میں شامل ہونے سے، عیسائی قیدیوں کے قتل کی دھمکی دے کر باز رکھا۔ کچھ عرصے بعد دوبارہ جنگ کی نوبت آئی تو اس بار عزالدین ایبک اسی شرط پر فرنگیوں سے اتحاد کرنے پر راضی ہو گئے۔ لیکن ۶۵۱ھ میں عباسی خلیفہ المستعصم باللہ نے دونوں مسلمان گروہوں کے درمیان اس تقسیم پر صلح کرادی کہ مصر اور جنوبی فلسطین (غزہ اور بیت المقدس) مملوکوں کے پاس رہیں گے جب کہ بقیہ شام ایوبیوں کے زیرِ نگیں رہے گا۔ اس کامیاب سیاست نے فرنگیوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ (تاریخِ شاکر ۶:۲۶)

کچھ عرصے بعد ممالیک کے دو گروہ بن گئے: ایک وہ جو عزالدین ایبک کے حامی تھے اور دوسرے وہ جو ملکہ شجرۃ الدر کے حامی تھے۔ ایک گروہ (ممالیک البحریہ الصالحیہ) کے امرا، شام اور کرک کی طرف بھاگ نکلے جہاں انھوں نے ایوبیوں سے اتحاد کرکے ممالیک المعزیہ اور عزالدین ایبک سے مصر چھیننے کی (۶۵۵ھ اور ۶۵۶ھ میں) دو دفعہ ناکام کوشش کی۔ عزالدین ایبک کے بعد اس کے نابالغ بیٹے نور الدین والی بنائے گئے جبکہ سیف الدین قُطُز ان کے نائب تھے۔ سلطنت کو ایوبیوں، منگولوں اور صلیبیوں کا سہ طرفی خطرہ لاحق تھا۔ اعیانِ سلطنت کے مشورے سے سیف الدین قطز کو والیِ مصر بنا دیا گیا۔ ۶۵۶ھ میں منگولوں نے بغداد پر حملہ کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا ڈالی۔ اس کے بعد تاتاری شام میں داخل ہوئے اور ۶۵۷ھ میں حلب اور ۶۵۸ھ میں دمشق پر قبضہ کرلیا۔ منگولوں کی طرف سے سیف الدین قطز کو دھمکی آمیز خط موصول ہوئے اور انھیں اطاعت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ لیکن سیف الدین قطز نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا اور ۲۵ رمضان ۶۵۸ھ میں عینِ جالوت کے مقام پر تاتاریوں کو شکستِ فاش سے دوچار کیا۔ جس کے بعد عام مسلمان بھی تاتاریوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ ہی عرصے میں دمشق اور دوسرے شامی علاقے تاتاریوں سے آزاد کرا لیے۔ (تاریخِ شاکر ۷:۲۹) سیف الدین قطز کے بعد رکن الدین بیبرس سلطنتِ ممالیک کے بادشاہ بنے۔ جنھوں نے تین سال قبل بغداد میں تاتاریوں کے ہاتھوں ختم ہونے والی عباسی خلافت کا ۶۵۹ھ کو قاہرہ میں احیا کیا۔ آخری عباسی خلیفہ

المستعصم باللہ کے چچا احمد ابن الظاہر بن الناصر العباسی المستنصر باللہ کے لقب سے خلیفہ بنائے گئے۔ صلیبی اب بھی بیت المقدس پر قبضے کے خیال سے باز نہیں آئے تھے اور اس دوران شاہ لوئیس عکا، قیساریہ اور صیدا کے قلعوں کی مرمت و مضبوطی کے کام میں مشغول تھا۔ ۶۶۱ھ میں بیبرس نے ناصرہ اور عکا پر حملہ کیا اگرچہ یہ شہر فتح نہ کر سکے لیکن ۶۶۳ھ میں انھوں نے قیساریہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے یافا شہر فتح کیا۔ بیروت پر ملکہ ازابیلا کی حکومت تھی جس نے سلطان سے صلح کر لی چند دوسری ریاستوں نے بھی اپنی نصف پیداوار کے عوض سلطان سے صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ سلطان کے کماندار قلاوون نے طرطوس اور مصیصہ وغیرہ فتح کر لیے۔ اس کے بعد قلاوون نے آرمینیا صغریٰ کے بعض علاقے فتح کیے اور کثیر مالِ غنیمت حاصل کیا۔ یہ وہ علاقے تھے جو ان کے دشمنوں کے حلیف رہا کرتے تھے۔ اس کے بعد سلطان انطاکیہ کی طرف متوجہ ہوئے جو اس علاقے میں ایک اہم صلیبی ریاست تھی۔ سلطان نے ۶۶۶ھ میں یہاں حملہ کر کے شہر فتح کر لیا اور صلیبیوں کی بڑی تعداد مقتول ہوئی۔ ۶۶۸ھ میں سلطان نے ایک بحری فوج جزیرۂ قبرص پر حملے کے لیے روانہ کی لیکن ناموافق ہواؤں کی وجہ سے فوج کو واپس آنا پڑا۔

۶۶۹ھ (۱۲۷۰ء) میں انھوں نے صافیتا اور عکار وغیرہ کے قلعے فتح کیے پھر انھوں نے طرابلس پر حملہ کیا جو ایک عرصے سے صلیبیوں کے تسلط میں تھا۔ کئی سرحدی علاقے فتح کرنے کے بعد قریب تھا کہ وہ پورا طرابلس فتح کر لیتے کہ انھی دنوں فرانس کا بادشاہ لوئیس نہم آٹھویں صلیبی حملے کی قیادت کرتے ہوئے فرانس سے نکلا۔ سلطان نے سمجھا کہ وہ شام یا مصر کی طرف آرہا ہے۔ اسی دوران طرابلس کے صلیبی حکمران بوہمانڈ کی طرف سے صلح کی درخواست آئی تو سلطان نے صلیبی حملے کے خطرے کی وجہ سے یہ درخواست قبول کر لی اور دس سال کے لیے صلح کا معاہدہ طے پا گیا۔ (آٹھویں صلیبی حملے کا رخ تیونس کی طرف تھا۔ لیکن طویل محاصرے میں اہلِ فرانس بھوک اور وبائی امراض کا شکار بنے۔ خود بادشاہ اور بڑی تعداد میں صلیبی جان کی بازی ہار گئے۔ بعد میں چارلس اہلِ تیونس سے پندرہ سالہ صلح کا معاہدہ کر کے واپس لوٹا)۔ (المماليك البحرية وقضائهم على الصليبيين في الشام، شفيق جاسر أحمد محمود)

۶۷۶ھ میں الملک الظاہر سلطان بیبرس کا انتقال ہوا۔ جس کے بعد ان کے دو بیٹے پے در پے حکمران بنے لیکن وہ

سلطنت نہیں چلا سکے تب ایک مملوک سردار سیف الدین قلاوون المنصور نے حکومت سنبھالی۔ یہ ایک باصلاحیت انسان تھے جو بیبرس کے نقشِ قدم پر چلے اور صلیبیوں کو بلادِ شام سے نکالنے کی جدوجہد شروع کی۔ ٦٨٦ ھ میں انھوں نے لاذقیہ فتح کیا۔ طرابلس کا حکمران بوہیمانڈ انتقال کر چکا تھا۔ اس کے ورثا تخت پر باہم لڑ رہے تھے۔ ایک گروہ کی طرف سے سلطان قلاوون کو حملے کی دعوت دی گئی جسے غنیمت سمجھتے ہوئے ٦٨٨ ھ میں حملہ کر کے طرابلس فتح کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے بیروت اور جبلہ وغیرہ کو صلیبیوں کے قبضے سے آزاد کرایا۔ اب صور اور صیدا، عکا اور چند دوسرے علاقے صلیبی قبضے میں رہ گئے تھے۔ صلیبیوں کی طرف سے دس سالہ صلح کے معاہدے کی پیشکش ہوئی۔ سلطان نے محسوس کیا کہ فوجوں کو آرام کی ضرورت ہے نیز انھیں تاتاریوں کی طرف سے بھی خطرہ لاحق تھا۔ اس لیے انھوں نے معاہدہ کر لیا لیکن ٦٨٩ ھ (١٢٩٠ء) میں ایطالیہ کی طرف سے ایک صلیبی لشکر عکا میں اترا اور آس پاس کے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے۔ سلطان اس واقعے پر سخت غصے میں آئے اور صلیبیوں سے انتقام لینے کے لیے روانہ ہوئے لیکن راستے ہی میں اچانک موت نے انھیں آلیا۔ اس کے بعد الاشرف خلیل بن قلاوون حکمران بنے۔ ٦٩٠ ھ میں وہ مصر اور شام کی مشترکہ فوجوں کے ساتھ عکا کی طرف روانہ ہوئے جو صلیبیوں کا ایک مضبوط گڑھ اور نئے صلیبی حملے کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور جسے جزیرۂ قبرص سے امداد بھی مل رہی تھی۔ سلطان نے عکا کا سختی سے محاصرہ کر لیا اور چوالیس روز کے محاصرے کے بعد یہ شہر ایک سو سالہ غاصبانہ صلیبی قبضے سے آزاد کرا لیا۔ بڑی تعداد میں صلیبی واصلِ جہنم کیے گئے۔ اس کے بعد الاشرف خلیل نے آسانی کے ساتھ صور اور حیفا فتح کر لیے۔ اس کے بعد انھوں نے عتلیت اور صیدا وغیرہ فتح کر لیے اس کے ساتھ ہی شام سے صلیبیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ البتہ ارواد جزیرے میں وہ موجود تھے آخر کار ٧٠٢ ھ میں ایک بحری فوج جزیرے کی طرف روانہ کی گئی اور اسے فتح کر لیا گیا۔ السلطان الاشرف خلیل کے انتقال کے بعد الملک الناصر محمد بن قلاوون بادشاہ بنے ٦٩٣ ھ سے ٧٠٨ ھ تک سرداروں کی بغاوت کی وجہ سے انھیں دو مرتبہ منصب چھوڑنا پڑا۔ ان کا تیسرا دور (٧٠٨ ھ تا ٧٤١ ھ) مملوک سلطنت کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس میں سلطنت اپنے بامِ عروج کو پہنچ گئی۔ الملک الناصر محمد بن قلاوون کے دور میں یورپ کے اکثر ملکوں کے سفیر دربار میں تحفے تحائف اور اپنے ہم مذہبوں کے لیے مذہبی اور تجارتی بہتری کی درخواستوں کے ساتھ حاضر ہوتے۔ قلاوون

خاندان کی حکومت ۷۸۴ھ تک رہی۔ ان کے آخری بادشاہ حاجی بن شعبان تھے جو کم عمری میں حاکم بنائے گئے تھے۔ سلطنت کے حالات دگرگوں تھے۔ قاضی بدر الدین نے اعیانِ سلطنت کو حاجی بن شعبان کی جگہ کسی طاقتور سردار کو حاکم بنانے کی تجویز دی چناچہ حاجی بن شعبان کے اتالیق امیر برقوق کو سلطان قرار دیا گیا۔ حاجی بن شعبان کے دور کے خاتمے کے ساتھ ہی ممالیک البحریہ کا دور ختم ہوا۔ سلطان برقوق سے جو سلسلہ شروع ہوا، وہ ممالیک البُرجیہ کہلاتا ہے۔ ان کا دور ۷۸۶ھ سے شروع ہو کر ۹۲۳ھ تک رہا(۱۳۴۱ء تا ۱۵۱۷ء) ان کے دور میں زیادہ تر داخلی انتشار ہی رہا۔ ۸۲۵ھ میں الملک الاشرف برسبائی حکمران بنے جن کا دور سولہ سال پر محیط رہا۔ ان کے دور میں سلطنت کو خاصا استحکام نصیب ہوا۔ انھوں نے سمندری راستوں کو ڈاکوؤں سے محفوظ بنا کر تجارت کو استحکام بخشا۔ جزیرۂ قبرص عرصۂ دراز سے صلیبیوں کا گڑھ تھا۔ سلطان نے یہاں حملہ کیا اور ایک زبردست معرکے میں عیسائیوں کو عبرتناک شکست دی اور ان کے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑ کر قاہرہ لایا گیا۔ عثمانیوں کے عروج تک قبرص جزیرہ ممالیک ہی کے تصرف میں رہا۔ سلطان برسبائی کے بعد کچھ عرصہ وہی عدمِ استحکام پھر جاری ہوا یہاں تک کہ سلطان قایتبائی ۸۷۲ھ تا ۹۰۱ھ (۱۴۶۷ء تا ۱۴۹۶ء) کے علاوہ کوئی حکمران لمبا عرصہ حکومت نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ۹۲۳ھ میں عثمانیوں نے ممالیک کی حکومت کا خاتمہ کر کے مصر اور شام کو اپنی تولیت میں لے لیا۔ سلطان سلیم اول فاتحانہ طور پر قاہرہ میں داخل ہوئے۔ بعد میں حجاز وغیرہ بھی عثمانیوں کے تسلط میں آ گیا۔ آخری عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ محمد بن المستمسك باللہ، سلطان سلیم اول کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق استنبول میں آیا صوفیا کے مقام پر ایک تقریب میں انھیں خِلعتِ خلافت سے نوازا گیا۔ اس تقریب میں آخری عباسی خلیفہ کے ساتھ علمائے ازہر اور عثمانی علاقوں کے دیگر علمائے کرام و فقہائے عظام بھی شامل ہوئے۔ اگلی چند صدیوں میں عالمِ اسلام کی سیادت و قیادت اور قبلۂ اول و دوم کی تولیت عثمانیوں کے ہاتھ رہی۔ (موسوعة سفير للتاريخ الإسلامي، واقدساه، دكتور سيد حسين العفّاني)

جاری ہے

* * * *

فرید بن مسعود
معاون قلم کار

اسکول بحیثیتِ ادارہ

پٹریشیا گرین فیلڈ ایک ماہرِ نفسیات ہیں اور ان کا شعبۂ اختصاص بچوں کی تعلیم ہے۔ ایک کتاب میں ''اسکول بحیثیت ادارے'' کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ اسکول فی نفسہ انفرادیت پسند انسان بنانے کی مشین ہے۔ ان کے مطابق اس کا ایک مظہر ان روایتی معاشروں میں بہت واضح ہوتا ہے جو ترقی کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ روایتی معاشرے خاندان کی اہمیت پر قائم ہوتے ہیں اور خاندان والے ایک دوسرے کے معاشی سہارے کی بنیاد بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے معاشرے میں ایک طرف تو اسکول معاشی بقا کے لیے لازمی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور دوسری طرف وہ شخص جو اسکول سے پڑھ کر کسی بھی قسم کا معاشی فائدہ حاصل کرتا ہے، وہ اس فائدے کو خاندان میں تقسیم کرنے سے کتراتا ہے۔ اس کے مطابق ایسی حالت میں معاشرے کا جزوِ فعال ایک خاندان سے ایک چھوٹی نوکلیئر فیملی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور آخر کار صرف ایک شخص کی ذات تک محدود ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ بہت سے مفلوک الحال خاندان اپنے میں سے کسی ایک یا دو کی تعلیم پر اس امید کے ساتھ 'اِنویسٹ' کرتے ہیں کہ اس سے بالآخر خاندان کا فائدہ ہو گا لیکن اسکول نامی مشین سے پیدا ہونے والا انسان خاندان مرکزی نہیں رہتا بلکہ اپنی ذات میں ہی گم ہو جاتا ہے۔

یہ سب اسکول میں پڑھائے جانے والے مواد کی کسی خامی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اسکول کے ڈھانچے میں ہی ایسی خاصیت ہے کہ یہ نتائج جنم لیتے ہیں۔ مثلاً اسکول میں موجود افراد (ہم جلیس، اساتذہ اور انتظامیہ) سے ایک غیر انسانی، اداراتی تعلق جس وجہ سے ان سے اپنائیت محسوس نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ اسکول میں موجود مسابقت کا رجحان ہر دوسرے

شخص کو ایک ایسی دوڑ میں شریک فرد بنا دیتا ہے جس کے آخر میں صرف جیتنے والا ہی کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ روایتی تعلیم چاہے کھیت پر خاندان کے افراد کے ساتھ کھیتی باڑی سیکھنے کی ہو یا کسی ماہر بڑھئی کے پاس وقت لگانا ہو، دونوں صورتوں میں شخصی تعلق ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پٹریشیا کے مطابق روایتی تعلیمی تناظر کل سے جز کی طرف لے کر جاتا تھا جبکہ اسکول کا تعلیمی سفر جز سے کل کی طرف جاتا ہے۔ وہ فونکس یعنی حروف تہجی کی آوازوں کی مثال دیتی ہیں جس سے ابتدا ہوتی ہے اور جملے کی کلیت بعد میں آتی ہے۔ اسی طرح تکنیکی علم بھی وسیع معاشرتی حقیقت کے تصور سے غیر متعلق ہو کر جز کو سمجھاتا ہے۔ اس کے برعکس روایتی معاشروں میں ہر علم بڑی حقیقت کے پیرائے میں سمجھا جاتا ہے اور معاشرتی تعلقات اور اسلاف کی اقدار کے ضمن میں اس کی حیثیت طے کی جاتی ہے چاہے بیج بونے کا علم ہو یا شاعری۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ''روایتی'' ان کے لیے کوئی مذہبی لفظ نہیں بلکہ وہ تو چین، افریقی اور لاطینی امریکہ کے ممالک سے مثالیں دیتی ہیں۔

اسکول کا یہ عنصری فرق ہی ایک معقول وجہ معلوم ہوتی ہے کہ انگریز نے صرف مواد کو تبدیل کر کے برصغیر میں پہلے سے جاری مکاتب کو ہی اسکول میں کیوں تبدیل نہیں کر دیا۔ گورمنٹ کالج لاہور کے سابق پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے بانیان میں شامل پروفیسر لائٹنر نے اپنی کتاب 'پنجاب کے مقامی نظامِ تعلیم کی تاریخ' میں اس پورے عمل کو تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح سکھوں اور مسلمانوں کے تاریخی نظام ہائے تعلیم کو پہلے اچھی طرح اکھاڑا گیا اور پھر اس کی جگہ نیا تعلیمی نظام لایا گیا۔ اسی ضمن میں اس بات پر غور کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ آیا اسکول کے موجودہ نظام کی 'اسلام کاری' سے کوئی روایتی مسلم شخصیت پیدا کی جا سکتی ہے؟ اور یہ بھی کہ آیا روایتی مسلم شخصیت آج کے معاشرے میں کسی سماجی اور معاشی مقام کو حاصل کر سکتی ہے؟

*****

مولانا حماد احمد ترک
نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

سفر نامۂ ترکی (۸)

ریحان لی سے شان لی عرفہ کا سفر تقریبًا چار گھنٹے کا تھا۔ راستے میں ایک جگہ کھانے کے لیے رکے۔ بہت ہی خوبصورت ہوٹل تھا، ہوٹل کے ساتھ مصنوعی ندی بنائی گئی تھی۔ یہ ہوٹل شام کی سرحد سے زیادہ دور نہ تھا اور شام کا پہاڑی سلسلہ بہت واضح نظر آرہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سفر دوبارہ شروع ہوا۔ گاڑی میں کوئی خرابی تھی اس لیے سفر طویل ہوگیا اور رات کے وقت شان لی عرفہ میں داخل ہوئے۔ وہیں ایک مقامی ہوٹل میں عشائیے سے لطف اندوز ہوئے۔ شان لی عرفہ کے کباب بہت مشہور ہیں اور یہاں کا خاصہ ہیں۔ ان کبابوں کی ہم نے جتنی شہرت سنی تھی اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ کھانے کے تمام اجزا بہت عمدہ تھے۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو آئی ایچ ایچ کے مرکز پہنچے اور رات یہیں قیام کیا۔

شان لی عرفہ کا اصل نام عرفہ ہے۔ شان لی کا مطلب ہے شان والا، شان دار۔ ۱۹۸۴ء میں Turkish Grand National Assembly نے عرفہ کو یہ لقب دیا۔ اس لقب کا پس منظر یہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب فرانسیسی افواج عرفہ پر حملہ آور ہوئیں اور بہت سے حصے پر قبضہ کرلیا گیا تو دار الحکومت سے مدد طلب کی گئی۔ سرکاری افواج پہلے ہی بہت سے محاذوں پر مصروفِ پیکار تھیں اس لیے عرفہ کے شہریوں کو از خود دفاع کا پیغام ملا۔ عرفہ کے مقامی لوگوں نے محدود وسائل اور دستیاب ہتھیاروں سے قابض فرانسیسی افواج پر حملہ کردیا۔ تربیت یافتہ افواج جو ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس تھیں اس پر زور حملے کی تاب نہ لاسکیں اور انھیں شکست کھاتے ہی بنی۔ فرانسیسی سپاہیوں کی پسپائی نے عرفہ کے شہریوں کی ہمت اور جرأت کے قصے ہر طرف پھیلا دیے اور عرفہ کی پارلیمنٹ کے ارکان کی سفارش پر عرفہ شہر کو سرکاری

طور پر ”شان لی“ کا لقب دیا گیا۔ اس شہر میں ترکوں کے علاوہ عربوں اور کردوں کی بھی خاصی تعداد مقیم ہے۔ ترکوں کے عمومی مزاج کے بر خلاف یہاں کھانے میں مرچ مسالے کا استعمال خوب کیا جاتا ہے۔ عرفہ کے مقامی کھانوں کی شہرت ترکی ہی میں نہیں عالمی سطح پر مسلم ہے۔ شام کی سرحد سے ملحق یہ شہر تاریخی اہمیت کا حامل اور کئی تہذیبوں کا راز دان ہے۔ ان دنوں موسم سرد ہے اور نومبر کا مہینا ہے اس لیے ہمیں دشواری نہیں ہوئی ورنہ عرفہ کی گرمی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ دو دن قبل استنبول میں ہمارے لیے جیکٹ اور مفلر کے بغیر نکلنا ممکن نہیں تھا جبکہ یہاں عام لباس میں بھی نکلا جا سکتا تھا۔ نمازِ فجر آئی ایچ ایچ کے مرکز میں ادا کی۔ نماز کے بعد سامان سمیٹ کر ناشتے کے لیے چلے آئے۔ ناشتے پر ہماری ملاقات استاذ بہجت کے ساتھ ہوئی۔ استاذ بہجت آئی ایچ ایچ کے نمائندے ہیں اور انتہائی جذبے کے ساتھ عالمِ اسلام کی خدمت میں کوشاں ہیں۔ کئی دہائیوں سے انھوں نے خود کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ استاذ بہجت اس ”فریڈم فلوٹیلا“ کا بھی حصہ تھے جو ۲۰۱۰ء میں فلسطینی مسلمانوں کی حمایت کے لیے روانہ ہوا۔ یہ ایک بحری امدادی قافلہ تھا جو کشتیوں پر مشتمل تھا۔ اسرائیلی ظالم افواج نے عالمی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے (جو کہ یہودی افواج کا عام وتیرہ ہے) اس غیر مسلح نہتے قافلے پر حملہ کر دیا جس میں متعدّد رضا کار شہید ہوئے۔ اس قافلے میں عالمی خبر رساں اداروں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اسرائیلی افواج نے فلسطینی مسلمانوں تک اس امداد کو نہیں پہنچنے دیا جو غذائی اجناس پر مشتمل تھی۔ قافلے میں شامل رضا کار گرفتار ہوئے جنھیں عالمی دباؤ پر رہا کر دیا گیا۔ بہجت صاحب نے دورانِ گفتگو مختلف مقامات کے حالات بیان کیے۔ بہجت صاحب کی گفتگو سننے کے لیے ایک ترجمان کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن بہجت صاحب شامی مسلمانوں کا ذکر کرتے ہی جذبات کی رو میں بہہ پڑتے۔ ان پر رقت طاری ہو جاتی اور بولتے چلے جاتے۔ ترجمان بار بار ان سے درخواست کرتا کہ آپ ٹھہر جائیں تاکہ میں اردو میں ترجمہ کر سکوں لیکن وہ ترجمان پر ہی برہم ہو جاتے۔ ترجمان ادھر بولنا شروع کرتا ادھر وہ بات کاٹ کر دوبارہ گفتگو شروع کر دیتے۔ ان کی گفتگو سے عیاں تھا کہ وہ شامی مسلمانوں کے لیے کس قدر فکر مند ہیں اور ان کے بہتر مستقبل کے لیے منصوبہ سازی کر رہے ہیں۔

استاذ بہجت کے ساتھ ملاقات ختم ہوئی تو شہر کی سیاحت کے لیے روانہ ہوئے۔ پہلا مقام مقامِ ایوب تھا جہاں ایک

غار کو حضرت ایوب علیہ السلام سے منسوب کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ علیہ السلام نے بیماری کے ایام میں اسی غار میں قیام کیا۔ یہ مقام انتہائی روحانی اور نورانی مقام ہے اور جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں یہیں بیٹھے رہیں، لیکن جگہ تنگ ہونے اور زائرین کی کثیر تعداد کی وجہ سے سپاہی تین منٹ بعد لوگوں باہر بلا لیتا ہے۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو اگلا قیام دار المرضیٰ پر ہوا۔

دار المرضیٰ پاکستانی احباب کے تعاون سے قائم کردہ ایک مرکز ہے جہاں شامی مہاجرین کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ یہاں معذور اور بیمار مہاجرین کو لایا جاتا ہے۔ جن کا مرض عارضی ہوتا ہے وہ صحت یابی کے بعد چلے جاتے ہیں اور باقی مریض اور معذور یہیں قیام کرتے ہیں۔ خواتین کے لیے ایک منزل مختص ہے جہاں صرف خواتین ہی کی تیمارداری کی جاتی ہے۔ ایک شامی مہاجر استاذ ابو موسیٰ کی نگرانی میں یہ مرکز شامی مہاجرین کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔ دار المرضیٰ میں مختلف جگہوں پر سبز ہلالی پرچم بھی دیواروں پر لگائے گئے ہیں جہاں پرچم کے ساتھ یہ جملہ لکھا ہوا ہے: شكراً، أهل باكستان۔ جب ہم نے ان معذور اور بیمار شامیوں سے گفتگو کی اور انھیں بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جو اٹھ سکتے تھے وہ اٹھ کر بہت تپاک سے ملے اور جو معذور تھے وہ دعائیں دینے لگے۔ ایک حصہ یتیم بچوں کے لیے متعیّن تھا جہاں تین سال سے دس سال تک کے بچے کھیل میں مشغول تھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے پاکستانی مسلمانوں کو اس کارِ خیر کی توفیق دی۔

دار المرضیٰ سے روانہ ہوئے اور قریب ہی واقع آئی ایچ ایچ کے لاجسٹک سینٹر پہنچے جہاں فاتح فاؤنڈیشن کی جانب سے شامی خاندانوں میں راشن کی تقسیم کا انتظام تھا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو وہاں موجود ایک شامی بزرگ شیخ ابراہیم نے ہمارا استقبال کیا۔ شیخ ابراہیم کی نگرانی میں ہی یہاں راشن تقسیم ہونا تھا لہٰذا انھوں تقسیم سے پہلے حضرت قبلہ استاذ مفتی اویس پاشا قرنی صاحب کو دعوت دی کہ وہ گفتگو فرمائیں لوگ متوجہ ہیں اور پاکستانی مسلمانوں کے جذبات سننا چاہتے ہیں۔ استاذِ گرامی نے مختصر سی گفتگو کی جس میں مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور باہمی اخوت کو اجاگر کیا۔ اس کے بعد شیخ ابراہیم نے گفتگو کی، انھوں نے پاکستانی مسلمانوں بالخصوص فاتح فاؤنڈیشن کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مفتی اویس پاشا صاحب کی گفتگو آپ نے سنی اور انھوں نے واضح عربی میں گفتگو کی جس کے ترجمے کی حاجت نہیں، پھر شیخ ابراہیم نے ایک حدیثِ مبارکہ سنائی اور اسی کی وضاحت پر مشتمل گفتگو کی۔

شیخ شامی النسل تھے اور نہایت فصیح عربی میں گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے یہ حدیث شریف سنائی جو بخاری میں وارد ہوئی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: «مَثَلُ المُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وتَرَاحُمِهِمْ وتَعَاطُفِهِمْ، مَثَلُ الجَسَدِ إذا اشْتكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى له سَائِرُ الجَسَدِ بالسَّهَرِ و الحُمَّى» رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”مؤمنوں کی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت و مودت اور باہمی ہمدردی کی مثال جسم کی طرح ہے کہ جب اس کا کوئی عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے بایں طور کہ نیند اڑ جاتی ہے اور پورا جسم بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے“۔

یہاں سے فارغ ہوئے تو آئی ایچ ایچ کی گاڑی میں قریب ہی ایک محلے میں جا پہنچے جہاں چند گھروں میں راشن پہنچانا تھا۔ رضاکاروں کے پاس پہلے سے ان گھرانوں کا ریکارڈ درج تھا۔ جاتے جاتے ایک رضاکار نے ہمیں بہت سے غبارے بھی تھما دیے جن پر آئی ایچ ایچ کا نام اور نشان منقش تھا، انھوں نے کہا کہ جن گھروں میں بچے نظر آئیں انھیں یہ غبارے تقسیم کر دیں۔ جہاں جہاں بھی ہم نے بچوں کو غبارے دیے بچوں نے بہت ہی خوشی کے ساتھ وصول کیے اور انھیں پھلانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگے۔ یہاں ہماری امدادی سرگرمی مکمل ہوگئی۔ جہاز کی روانگی میں کافی وقت تھا لہٰذا شہر کی سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ عرفہ میں ایک جگہ مقامِ ابراہیم کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے نمرود نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا تھا۔ اس مقام پر دو بلند ستون ہیں جن کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ ان ستونوں پر غلیل بنا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اچھالا گیا تھا۔ کچھ دور ایک انتہائی قدیم عمارت کی باقیات ہیں جہاں محراب پر یہ قرآنی آیت لکھی ہوئی ہے کہ ”اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی والی ہو جا ابراہیم پر“۔ اس کے ساتھ ہی ایک تالاب ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں نمرود کے حکم پر آگ لگائی گئی تھی جو تالاب میں تبدیل ہوگئی۔ اور تالاب میں کثیر تعداد میں سیاہ رنگ کی خوبصورت مچھلیاں تیر رہی تھیں جوان لوگوں کے خیال میں وہ لکڑیاں تھیں جو بطورِ ایندھن وہاں جمع کی گئی تھیں۔ لیکن یہ ساری باتیں حقیقت سے بہت دور معلوم ہوتی ہیں کیونکہ مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ”بابل“ بتایا ہے جو عرفہ سے بہت دور ہے۔ صرف مقامِ ابراہیم ہی نہیں اور بھی بہت سے مقامات ہیں جن کی نسبت درست معلوم نہیں ہوتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس سے ترکوں کی خوش عقیدگی ظاہر ہوتی

ہے۔اسی مقام پر ایک شخص قدیم عثمانی سلاطین کی طرز کی قبائیں اور شاہی طرز کی ٹوپیاں تھامے کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ تین لیرا کے عوض یہ لباس پہن کر لوگ تصاویر کھنچواتے ہیں اور پھر لباس واپس کر دیتے ہیں۔ عثمانیوں سے عقیدت نے ہمیں بھی مجبور کیا کہ چند لمحات کے لیے ہی صحیح، یہ شاہی لباس ضرور زیب تن کرنا چاہیے چنانچہ فوراً اس آدمی سے شاہی قبا اور عمامہ لیا اور پہن کر مقامِ ابراہیم میں موجود محراب کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ جب لباس واپس کیا تو اس آدمی نے ہم مہمانوں کا اکرام کرتے ہوئے پیسے لینے سے انکار کر دیا، محض دعاؤں کی درخواست کی اور لباس واپس لے لیا۔

اسی مقام سے متّصل ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ وہی عرفہ کے کباب اور خاص ذائقہ یہاں بھی میسر آیا۔ کھانے کے بعد ایک طویل راستے سے واپس روانہ ہوئے۔ یہ مقام بلندی پر واقع ہے۔ آتے وقت تو گاڑی پر آئے تھے لیکن واپس جاتے ہوئے سیڑھیوں کا استعمال کیا۔ ان سیڑھیوں سے پورے شہر کا بآسانی نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ جہاز کی روانگی کا وقت قریب تھا لہٰذا شان لی عرفہ کے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوئے۔ ترکش ایئر لائن کی دو گھنٹے کی پرواز کے بعد استنبول ایئر پورٹ پہنچے اور بس کے ذریعے بہت سہولت کے ساتھ رہائش گاہ پہنچ گئے۔ رات گہری ہو چکی تھی چنانچہ جلد ہی نیند نے آغوش میں لے لیا۔

نمازِ فجر کے لیے اٹھے تو وہی ہاؤ ہو سنائی دی جو گزشتہ پیر سنی تھی۔ پیر بازار کے لیے دور دور سے سبزی فروش، پھل فروش، برتن اور نجانے کیا کیا کچھ لے کر بازار جمانے کو تیار تھے۔ نمازِ فجر باجماعت ادا کر کے ناشتے کی خریداری کے لیے بازار میں نکل گئے۔ بازار سے کچھ سامان لیا اور پھر ایک بیکری میں داخل ہو گئے جہاں "بوریک" فروخت ہو رہا تھا۔ بوریک کا ذکر گزشتہ اقساط میں ہو چکا ہے۔ بیکری میں ہی ناشتے کا پہلا دور ہوا جس میں مختلف اقسام کے بوریک کام میں لائے گئے۔ پھر ذرا آگے بڑھے تو ایک جگہ انواع و اقسام کے سوپ تیار ہو رہے تھے، کچھ وقت (بقولِ اکبؔر) "سوپ کاری" کی نذر ہو گیا۔ یہاں سے نکلے تو استاذِ محترم کے ساتھ قریب ہی "بابِ عالم" پہنچ گئے۔ بابِ عالم ایک ادارہ ہے جو طلبہ کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا ہے۔ ترکی میں جتنے بھی بیرونی ممالک کے طلبہ آتے ہیں، اس ادارے کے منتظمین انھیں تھوڑا بہت وظیفہ بھی دیتے ہیں۔ بابِ عالم میں داخل ہوئے تو مختلف کمرے اور مختلف میزیں نظر آئیں، معلوم ہوا کہ ہر برّاعظم کے لیے ایک الگ میز مختص ہے جہاں اس خطے کے طلبہ ہی جمع ہوتے ہیں، اور ہر میز پر کچھ معاونین (coordinators) ہوتے ہیں جو در حقیقت سینیر طلبہ ہوتے ہیں۔ بابِ عالم

کے تحت ان طلبہ کو مطالعے کے لیے کتب دی جاتی ہیں، تربیتی نشستیں منعقد ہوتی ہیں، نیز طلبہ کو سیاحتی مقامات پر بھی لے جایا جاتا ہے۔ ایک خطے کے طلبہ کا دیگر خطوں کے لوگوں سے رابطہ رہتا ہے، کبھی کھانا اور دعوتِ افطار وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ ایک خطے کے مسلمانوں کے مسائل سے باقی عالمِ اسلام کو آگاہی ہوتی ہے۔ اس سے دو بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں: اول تو یہ کہ طلبہ دیارِ غیر میں جاکر خراب نہیں ہوتے، نظریاتی طور پر پختہ اور فعال رہتے ہیں، دوسرے یہ کہ پوری امت کے احوال و مسائل سے واقف ہوجاتے ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر اپنی ذات، اپنی قوم اور اپنا ملک نہیں رہتا بلکہ اقبالؔ کے بقول ان کا عقیدہ یہ بن جاتا ہے کہ "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" ہر ملک ہمارا ملک ہے کیونکہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔ یہ ادارہ اگرچہ بہت بڑا نہیں ہے لیکن اپنی ذات میں انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔ یہاں سے باہر نکلے تو رہائش کا رخ کیا۔ اب بازار سے گزرے تو منظر بدل چکا تھا۔ خوب گہما گہمی تھی اور بازار پوری طرح سج گیا تھا۔ ہم نے ناشتے کے لیے خریداری کی اور واپس رہائش گاہ پہنچ گئے۔ آج استنبول میں ہمارا آخری دن تھا اور کل شام ہمیں کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ویسے تو استنبول میں کئی اہم مقامات دیکھنے سے رہ گئے تھے اور دس دن کے سفر میں ان سب کا احاطہ ممکن بھی نہیں تھا لیکن ایک اہم مقام "اسماعیل آغا جامی" دیکھنا ناگزیر تھا، چنانچہ تیاری کرکے رہائش گاہ سے نکلے اور روانہ ہوگئے۔ بس اسٹاپ پر کافی انتظار کے بعد بس آئی، ہمارے یہاں بس کا انتظار نسبتاً مشکل ہوتا ہے کیونکہ کچھ معلوم نہیں ہوتا تین منٹ کا انتظار ہوگا یا تیس منٹ کا۔ استنبول کی بسیں گوگل میپ کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں، چنانچہ آپ نقشے پر بس کی آمد کا وقت بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی چنانچہ کھڑے ہوکر سفر کرنا پڑا۔ یوں تو کراچی کی اصطلاح میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو بس میں بیٹھ کر سفر کیا جاتا ہے یا لٹک کر، عموماً تیسری صورت کم ہی درپیش ہوتی ہے۔ استنبول کی بسوں میں کرسیاں کم ہوتی ہیں، خالی جگہ زیادہ ہوتی ہے۔ بہرحال؛ پندرہ منٹ بعد ہم استنبول کی روحانیت اور نورانیت کے مرکز "اسماعیل آغا" پہنچ گئے۔ یہ اسماعیل آغا آخر کیا ہے؟ یہ جاننے کے لیے ابھی کچھ مت کیجیے، صرف انتظار کیجیے ہماری اگلی قسط کا جو کہ اس سفرنامے کی آخری قسط ہوگی ان شاء اللہ۔

جاری ہے

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

راشن مہم وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم دینا

سوال: آج کل راشن وغیرہ کے لیے مہم چلائی جاتی ہے، لوگ اس میں زکوٰۃ کے پیسے بھی دیتے ہیں۔ جہاں تک میں نے سنا تھا کہ زکوٰۃ کے پیسے جس کو دیے جائیں اس کو اس کا مالک بنایا جائے، تو کیا زکوۃ کی رقم اس طرح کی مہم وغیرہ میں دیے جاسکتے ہیں؟ اسی طرح ہسپتالوں میں این جی اوز زکوٰۃ کی رقم سے دوائیاں فراہم کرتی ہیں، اس کے بارے میں بھی رہنمائی فرمادیں۔ جزاک اللہ خیراً

جواب: مختلف تنظیموں اور رفاہی اداروں میں اگر فقرا رجسٹرڈ ہوں یعنی ان کی کفالت ادارے نے اپنے ذمے لی ہوئی ہو اور فقرا نے ان کو زکوۃ کی وصولیابی کا وکیل بھی بنایا ہو تو ایسی صورت میں یہ ادارے فقرا کے وکیل ہوں گے اور ان کو زکوۃ دینے سے زکوۃ ادا ہو جائے گی البتہ اس میں ضروری یہ ہے کہ ادارے کو جو چیز زکوۃ کی مد میں دی جائے، ادارہ اس کو بغیر تبدیلی کے فقیر تک پہنچائے؛ رقم ہو تو رقم اور راشن ہو تو راشن۔ لیکن اگر فقرا نے ادارے کو اس طرح وکیل بنایا کہ ادارہ ان کی طرف سے زکوۃ وصول کر کے کسی بھی جگہ خرچ کرے تو اس صورت میں اس رقم کو ہر جائز مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے۔

اگر فقرا کسی ادارے میں رجسٹرڈ نہ ہوں بلکہ ادارہ مستحقین کے لیے زکوۃ جمع کر کے ان پر خرچ کرتا ہو تو ایسی صورت میں یہ ادارہ زکوۃ دینے والوں کا وکیل ہوگا اور جب تک یہ ادارہ اس زکوۃ کی رقم کو کسی مستحق کے قبضے میں نہ دے اس وقت تک زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ اس میں ادارے پر یہ لازم ہوگا کہ اس رقم کو ایسی جگہ خرچ کرے جہاں زکوۃ کی رقم کا استعمال

جائز ہو، البتہ اس میں ادارے کو یہ اختیار بھی ہو گا کہ وہ اس رقم کو ضرورت مند شخص کی کسی ضرورت میں تبدیل کر کے مستحقین کے حوالے کر دے۔ لہذا جس تنظیم یا رفاہی ادارے پر اعتماد ہو کہ وہ آپ کی زکوۃ صحیح مصرف میں ہی خرچ کرے گا تو اس کو زکوۃ کی رقم دی جا سکتی ہے۔

أن الوكيل بالقبض إنما يملك القبض على وجه لا يكون للموكل أن يمتنع منه إذا عرضه عليه المطلوب فليس للوكيل بالقبض ذلك كالشراء بالدين والاستبدال. (المبسوط للسرخسي، ١٩/ ٦٩)

والله أعلم بالصواب

فتوی نمبر:۴۷۷۵

*****

سلیم احمد (۱۹۲۷ء۔۱۹۸۳ء)

معروف نقاد اور شاعر

ادھوری جدیدیت (۱)

جدیدیت کی روح یہ اصول ہے کہ کسی بات کو اس بنا پر تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ ہم سے پہلے سے چلی آ رہی ہے، یا ہم پر خارج سے عائد کی گئی ہے یا ہم سے بالاتر ہے، بلکہ ہر چیز کے حسن و قبح، خیر و شر، منفعت و مضرت کا فیصلہ تجربے کی روشنی میں کیا جائے۔ اس لیے جدیدیت کے معنی زیادہ سے زیادہ "تجرباتی" ہونے کے ہیں۔ لیکن تجربہ کس کا؟ ہمارا اپنا۔۔۔ اور اگر ہم کسی دوسرے کے تجربے کو قبول بھی کرتے ہیں تو اس شرط پر کہ ہم جب چاہیں اپنے تجربے کی بنا پر اسے رد کر دیں۔ ظاہر ہے کہ ان معنوں میں جدیدیت مذہب کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ مذہب کی بنیاد عقیدہ، وحی، ایک مافوق الفطرت قوت کے اقرار اور اس کے احکام کے سامنے بے چوں و چرا سر جھکانے پر ہے۔ اسی طرح جدیدیت اخلاقی قیود کو بھی تسلیم نہیں کرتی کیونکہ اخلاق کا تعلق بھی بالعموم مذاہب ہی سے رہا ہے اور جہاں براہِ راست مذہب نہیں ہے، وہاں ایک بالاتر ہستی یا کم از کم خارجی دباؤ کے اثرات ضرور موجود رہے ہیں۔ بالفرض اخلاق کے معنی صرف معاشرتی اصولوں کے لیے جائیں تو بھی معاشرے کا خارجی دباؤ اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کی طرح جدیدیت معیارات کو بھی نہیں مانتی۔ کیوں کہ معیار کے معنی پھر کسی خارجی پیمانے کو تسلیم کرنے کے ہیں۔ جدیدیت ان سب چیزوں کا انکار کرتی ہے۔ اس بنا پر کہ یہ ذاتی تجربے کی راہ کے پتھر ہیں لیکن انکار کے معنی اثبات کا دروازہ بند کرنے کے نہیں ہیں۔ جدیدیت ان میں سے کسی کا بھی اثبات کر سکتی ہے، بشرطیکہ ذاتی تجربہ اس کی تصدیق کرے۔ لیکن جو آدمی حسن و قبح اور خیر و شر کے معاملات میں ذاتی تجربے کو بنیاد بناتا ہے وہ انفرادیت پسند ہوتا ہے۔ جدید ہونے کے معنی انفرادیت پسند ہونے کے ہیں۔ یہاں انفرادیت پسند ہونے کے معنی وہ نہیں ہیں جو عام طور پر مراد لیے جاتے ہیں۔ انفرادیت پسند اسے نہیں کہتے جو صرف دوسروں سے مختلف ہونا چاہتا ہے بلکہ اسے

جو ہر چیز کا پیمانہ اپنی ذات کو سمجھتا ہے لیکن یہ ذات بھی کوئی مقررہ یا طے شدہ چیز نہیں ہے۔ ہمارے محسوسات اور جذبات بدلتے رہتے ہیں، پسند اور ناپسند میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، خیالات وافکار میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے انفرادیت پسندی کے معنی تغیر پسندی کے بھی ہیں۔ تو جدیدیت کے معنی زیادہ سے زیادہ تجرباتی، زیادہ سے زیادہ انفرادیت پسند اور زیادہ سے زیادہ تغیر پسند ہونے کے ہیں۔ نشاۃِ ثانیہ کے بعد کی مغربی تہذیب کو ہم ان ہی معنوں میں جدید کہتے ہیں۔ اچھا، اس لفظ کو اب اپنی تاریخ کے پس منظر میں دیکھیے۔ غدر سے پہلے جدید کا لفظ صرف ''نئی چیز'' یا ''نئی بات'' کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کے معنی صرف اتنے تھے کہ ہر نئی چیز یا نئی بات یا نیا کام مزیدار معلوم ہوتا ہے لیکن غدر کے بعد اس لفظ کا استعمال اس سے مختلف معنوں میں ہونے لگا، مثلاً جدید شاعری کے معنی اس شاعری کے ہوئے جو ''پیروئ مغربی'' میں کی جائے۔ یا جدید مذہب کے معنی اس مذہب کے ہوئے جو سائنس یا عقل کے مطابق ہو۔ اس اختلافِ معنی کے علاوہ ایک اور فرق یہ پیدا ہوا کہ اس سے پہلے جدید ہونا انفرادی اُپَج کا نتیجہ ہوا کرتا تھا، لیکن اب جدید ہونا ایک مستقل رجحان بن گیا ہے اور اس رجحان کے ساتھ یہ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ہر بار لفظ جدید کی ایک نئی تعریف کی جائے۔ چنانچہ حالی کے زمانے کی جدیدیت اور چیز ہے، نیاز فتح پوری اور ان کے ساتھیوں کی جدیدیت اور چیز، ۱۹۳۶ء کے ادیبوں کی جدیدیت اور ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد کے ادیبوں کی اور۔ اور اب تو یہ نوبت ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کے جتنے گروپ ہیں، جدیدیت کے اتنے ہی معنی ہیں۔ بظاہر یہ صورتِ حال پریشان کن معلوم ہوتی ہے لیکن ہے جدیدیت کی روح کے عین مطابق۔ بعض لوگ سوال اٹھاتے ہیں کہ اس صورت میں تو تہذیب، اخلاق اور فن کے سارے معیارات تباہ ہو جائیں گے۔ ہمارا واضح اور حتمی جواب یہ ہے، اگر ایسا ہوا تو یہ جدیدیت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔ لیکن فی الحال اس بحث میں الجھنے کے بجائے ہم اردو شاعری میں جدیدیت کا سلسلۂ نسب متعیّن کرنا چاہتے ہیں۔ اردو شاعری میں جدیدیت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا شاعر غالب ہے۔ غالب سے پہلے جو کچھ ہے، روایتی معاشرے کی روایتی شاعری ہے۔ اس کے بعد کوئی ایسا شاعر پیدا نہیں ہوا جس کی ذاتِ واحد میں جدیدیت کی اتنی خصوصیات جمع ہوں۔ مذہب، عقیدہ، احکام، اخلاق اور معیارات سب کے سب اس بت شکن کی سبک دستی کے بہانے ہیں اور وہ ان چیزوں کو کسی خارجی کسوٹی پر رد نہیں

کرتا بلکہ صرف اپنی ذات کے پیمانے پر۔ یہاں بعض لوگوں کو غالب کی انانیت یاد آئے گی۔ لیکن گھسے پٹے خیالات نے ہر بات کی تفہیم ناممکن بنادی ہے۔ انانیت ہو یا کوئی اور صفت، شاعری میں تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ شاعر نے اسے تشخیصِ حقیقت یا انکشافِ ذات کا ذریعہ بنایا ہے یا نہیں۔ انانیت پسند تو غالب سے پہلے بھی گزرے ہوں گے اور اپنی تمام زندگی میں میر، غالب سے زیادہ انانیت پسند تھے اور یوں کہنے کو انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ”حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے“ یا ”اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں“ لیکن یہ سب روایتی معاشرے کے روایتی خیالات ہیں۔ غالب کی انانیت پرستی صرف و محض انانیت پرستی نہیں تھی۔ یہ غالب کی وہ قوت تھی جس کی مدد سے وہ ہر خارجی معیار کو رد کرکے ذاتی حقائق کی اجنبی سرزمین میں داخل ہوتا ہے۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

یا

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اور ان معنوں میں وہ جن حقائق تک پہنچتا ہے، ان کے بارے میں اس کا یہ دعویٰ سچا ہے کہ میں عندلیبِ گلشن ناآفریدہ ہوں۔ یہ گلشن ناآفریدہ کیا ہے؟ ایک بے حد جدید دنیا ہے جس میں حق و باطل کا تعین مافوق الفطرت عقیدوں کی بنا پر نہیں ہوتا۔ نہ خیر و شر کے معیارات خارجی طور پر عائد کیے جاتے ہیں، نہ اجتماعی واہموں کو قانون کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ دنیا ایک حد درجہ آزاد فرد کی دنیا ہے جس کا خالق، حاکم اور قانون وہ آپ ہے اور یہ فرد انتہا کا انفرادیت پسند ہے۔ انفرادیت پسند اور تغیر پسند۔ اسے ایک طرف وبائے عام میں مرنا قبول نہیں ہے اور دوسری طرف جنت اس لیے قبول نہیں ہے کہ ”ہے ہے اقامت جاودانی ہے“۔ غالب کے زمانے میں یہ دنیا صرف غالب کے خوابوں میں بستی تھی۔ غالب نے خواب اور حقیقت کو اس طرح ملایا کہ آج یہ دنیا ہم سب کی تقدیر ہے۔ جدید دنیا غالب کی دنیا ہے۔ لیکن غالب کے مقابلے میں جدید شاعری کرنے اور جدید شاعری کی بنیاد ڈالنے والے حالی کی شاعری کچھ یوں ہی سی جدید ہے۔ اس بنا پر نہیں کہ غالب بڑا شاعر تھا اور حالی چھوٹے شاعر تھے۔ اس بنا پر

کہ حالی نے جدیدیت کے معنی قومی زبوں حالی یا مناظرِ فطرت پر نظمیں لکھنا سمجھا۔ یہ شاعری ان معنوں میں تو جدید ضرور تھی کہ اردو والوں کے لیے نئی تھی لیکن جدیدیت، حقیقی جدیدیت سے حالی کی طبیعت کو رتی بھر بھی مناسبت نہیں تھی۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ فردِ غالب کی طرح اتنی بڑی آزادی کا خواب دیکھ سکتا ہے۔ انھیں جدیدیت سے زیادہ اپنا مفلر عزیز تھا۔ پھر حالی میں یہ سکت بھی نہیں تھی کہ اپنی ذات کو پیمانۂ اقدار بنا سکیں۔ ان کی زندگی میں سرسید اور کرنل ہالرائیڈ داخل نہ ہوتے تو وہ رنگِ قدیم پر ہی قائم رہتے۔ وہ جدید شاعری اس لیے نہیں کرتے کہ ان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ جدید شاعری وہ اس لیے کرتے ہیں کہ سرسید اور کرنل ہالرائیڈ کا تقاضا ہے۔ حالی میں اخلاق پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ تو میرے خیال میں بائیں ہاتھ سے پانی بھی نہیں پیتے ہوں گے۔ ایسے آدمی کا فطری جدیدیت سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ حالی جدید نہیں تھے، زمانے اور سرسید کی ستم ظریفی نے انھیں جدید بنا دیا تھا۔ اور آپ چاہیں تو اسے میری ستم ظریفی کہہ لیں کہ مجھے حسرت، حالی سے نسبتاً زیادہ جدید معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ''نسبتاً'' کہا ہے۔ بظاہر یہ بات کچھ الٹی سی معلوم ہوتی ہے۔ حسرت نے حالی کی طرح نظم نگاری نہیں کی جسے عام طور جدیدیت کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک قطعی روایتی ذریعۂ اظہار یعنی غزل کو اپنایا اور اس میں بھی انفرادیت کے بجائے دوسروں کی تقلید کو یہاں تک کام میں لائے کہ ایک طرح سے پوری اردو غزل کو دوبارہ لکھ دیا لیکن اس کے باوجود یہ حسرت ہی ہیں جو،

قول کو زید و عَمرو کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنی ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ ایک غیر روایتی خیال ہے اور خواہ اسے پوری طرح جدید نہ کہا جا سکے مگر اس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح انفرادیت پرستی سے مل جاتا ہے۔ یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کی ذاتی زندگی اور اس کی شاعری میں کتنی مطابقت ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ذاتی زندگی میں ایک شاعر قدیم ہو لیکن اس کی شاعری جدید ہو اور صورتِ حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے۔ حسرت کی شاعری پر ان کے تمام خیالات کا بہت زیادہ اثر نہیں معلوم ہوتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کی شاعری میں تجربے کا براہِ راست بیان ان کی زندگی سے پیدا ہوا ہے۔ وہ حسن و عشق کو موضوع بناتے ہیں مگر ان کا حسن و عشق روایتی نہیں

ہے، اس میں حسرت کی شانِ اجتہاد ہے اور اگر کہیں کہیں وہ روایتی حسن و عشق سے ہم آہنگ بھی ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے روایت کو روایتی طور پر قبول کیا ہے بلکہ اس لیے کہ ان کے تجربے نے اس کی تصدیق کی ہے۔ حسرت کی جدیدیت کا ایک اور پہلو روایتی عشقِ حقیقی سے ان کا گریز ہے اور یہ گریز شعوری ہے۔ غزل کی روایت میں اس شعوری گریز کے معنی اس اعتبار سے اہم ہیں کہ حسرت کی غزل اس کے ذریعے قدیم غزل گوئی کے بجائے جدید غزل سے اپنا رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ حالی کی جدید غزل "جدید" کا عنوان اپنے ماتھے پر سجانے کے باوجود اتنی جدید نہیں ہے جتنی حسرت کی غزل۔ حسرت کی غزل کا رشتہ آگے چل کر حسن و عشق کی بدلتی ہوئی روایت سے مل جاتا ہے جبکہ حالی کی جدید غزل اپنے قومی اور سیاسی مضامین کے باوجود جہاں کی تہاں رہ جاتی ہے۔ لیکن حسرت کی جدیدیت بہر حال ایک ایسے آدمی کی جدیدیت ہے جو کسی نہ کسی طرح قدیم روایتی تہذیب کی طرف لوٹنا چاہتا تھا یا کم از کم اس سے اپنا رشتہ ضرور قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اکبر کی شاعری میں روایتی معاشرے اور روایتی تہذیب کی طرف واپسی یا اس سے وابستگی کی کوشش بہت شعوری ہو کر نمایاں ہوئی ہے۔ ان معنوں میں اکبر جدیدیت کے ایک پر زور مخالف کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ لیکن جدیدیت سے جنگ اکبر نے جدیدیت کے اپنے ہتھیاروں سے لڑی ہے اور غور سے دیکھا جائے تو یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک شاعر کا شعور جدیدیت کو خود کسی حد تک قبول نہ کرلے۔ اکبر روایت پسند یا روایتی اس لیے نہیں ہیں کہ ان کی تربیت نے انھیں ایسا بنا دیا ہے۔ وہ روایتی ان معنوں میں ہیں کہ روایت کو شعوری طور پر پسند کرتے ہیں۔ یعنی اس کی تصدیق اپنے تجربے میں ڈھونڈتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ حالی ماضی کے اور اکبر حال کے شاعر ہیں۔ محمد حسن عسکری کہتے ہیں کہ اکبر ان معنوں میں حالی سے جدید تر ہیں کہ انھیں جدید چیزوں میں نئی نئی علامتیں نظر آتی ہیں۔ میرے نزدیک اکبر کی جدیدیت ان کے "تجرباتی" ہونے میں پوشیدہ ہے۔ وہ ہر اس چیز کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں جو ان کے تجربے میں سچی ہے اور تجرباتی سچائی کے ساتھ ان حقائق کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں جو ان کی شعوری پسندیدگی کے خلاف جاتے ہیں، مثلاً یہ بات کہ،

شعرِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب
اس کو یہ معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

ایک سچے تجرباتی رویے کے بغیر نہیں کہی جاسکتی۔اس کے علاوہ وہ ایک معنوں میں انفرادیت پرست بھی ہیں کہ جب تاریخ کا پورا دھارا ان کے خلاف جارہا تھا اور زمانے کی عام روش ''چلو اس طرف کو ہوا ہو جدھر کی'' تھی، اس وقت وہ،

ناز کیا اس پہ زمانے نے جو بدلا ہے تمھیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

کہہ، ہر زمانے کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ دیکھیے کتنی عجیب بات ہے کہ حالی کے زمانے میں جدید کے معنی قدیم معاشرے سے منقطع ہونے کے ہیں اور اکبر کے زمانے میں جدید معاشرے سے شعوری جنگ کے۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر اپنی پسندیدگی میں روایتی اور اپنے رویے میں جدید ہیں جبکہ حالی اپنی پسندیدگی میں جدید اور اپنے رویے میں روایتی تھے۔ مجھے احساس ہے کہ شاعری ایک بہت پیچیدہ چیز ہے۔ اسے انفرادی اور اجتماعی شعور اور لاشعور کی اتنی آڑی ترچھی لکیریں کاٹتی ہیں کہ کسی شاعر کے بارے میں ایک معمولی سی بات کہنا بھی ہزاروں اختلافات کا دروازہ کھولنے کے برابر ہوتا ہے، پھر زندگی کی جدلیات ہماری تعریفوں پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ جدیدیت کے ایک معنی تو وہ ہیں جو میں نے غالب کے سلسلے میں متعیّن کیے ہیں یعنی مذہب، عقیدے، اخلاق اور طریقۂ سلف کے خلاف آزادہ روی، انفرادیت پسندی اور تغیر پرستی۔ لیکن اقبال کے سلسلے میں آپ کیا کہیں گے۔ اقبال ایک طرف تو اس خیال کے حامی ہیں کہ ملت از ضبط روایت محکم گردد۔ اس کے علاوہ اسلام پسند ہیں اور اسلامی عقائد، اخلاق اور روایات کے زبردست حامی اور مفسر ہیں۔ یعنی اس سلسلے میں ان کا رویہ یکسر روایتی ہے۔ دوسری طرف وہ ''گفتند جہان ما آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن'' کا نعرہ لگاتے ہیں۔

جاری ہے

* * * * *

سفرنامہ: مفتی اویس پاشاقرنی

ضبط وترتیب: مولانا محمد اقبال

افغان نامہ (۲)

سفرِ افغانستان کی مختصر روداد

افغانستان کی مختصر تاریخ: ایک جائزہ

جنرل نادر خان سردار یوسف خان کے بیٹے، سردار یحیٰ خان کے پوتے اور سردار سلطان محمد خان کے پڑپوتے ہیں۔ سردار سلطان محمد خان، محمد زئی قبیلے سے تعلق رکھنے والے افغانستان کے پہلے فرماں روا سردار دوست محمد خان کے بھائی ہیں۔ انگریزوں کے ساتھ دوسری جنگ کے بعد جب افغانستان میں امیر عبد الرحمٰن خان اقتدار پر قابض ہوئے تو نادر خان کے دادا سردار یحیٰ خان جو یعقوب خان کے سسر بھی تھے، افغانستان سے فرار ہوئے اور انگریزوں کے ہاں سیاسی پناہ لی۔ اس کی وجہ مؤرخین یہ بتاتے ہیں کہ سردار یحیٰ خان نے یعقوب خان کے ساتھ مل کر انگریزوں کے ساتھ ''معاہدۂ گندمک'' میں حصہ لیا تھا۔ اس معاہدے کی تفصیل یہ ہے کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد برطانیہ ہندوستان پر قابض ہوا تو اس زمانے میں زارِ روس تاشقند اور سمرقند پر قبضہ جماتے ہوئے افغانستان کی سرحد دریائے آمو تک آپہنچا تھا۔ لہٰذا ساٹھ کی دہائی میں مقبوضہ ہندوستان کی مغربی سرحد پر برطانوی حکومت کے لیے خدشات پیدا ہوگئے تھے۔ امیر دوست محمد خان کی وفات اور امیر شیر علی خان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد جب روسی وفد نے کابل کا دورہ کیا تو انگریزوں نے پھر افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی اور ۲۱ نومبر ۱۸۷۸ء کو تین برطانوی لشکروں نے مختلف محاذوں پر افغانستان پر چڑھائی کی۔ ایک لشکر جنوب سے قندھار پر حملہ آور ہوا، ایک دستے نے جنرل رابرٹس کی سرکردگی میں کُرم کے راستے سے

حملہ کیا، جبکہ ایک بڑا حملہ جنرل سام براؤن کی زیرِ قیادت پندرہ ہزار فوج کے ساتھ درۂ خیبر سے ہوا۔ غیور پشتون قبائل نے کسی حکومتی امداد کا انتظار کیے بغیر انگریزوں کا سامنا کیا مگر انگریزوں کے جدید جنگی سازو سامان کے مقابلے میں بھاری جانی نقصان اٹھانے کے باوجود انگریزوں کا راستہ نہ روک سکے اور انگریز فوج جلال آباد پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ امیر شیر علی خان دنیا سے رحلت کر چکے تھے اور امیر یعقوب خان نئے افغان بادشاہ مقرر ہوئے تھے۔ یہ سردیوں کا موسم تھا انگریزوں کے لیے اس موسم میں افغانستان میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا، اس لیے وہ جلد کسی معاہدے پر پہنچنے کے لیے کوشاں تھے۔ امیر یعقوب خان کے لیے یہ نادر موقع تھا کہ وہ انگریزوں کو سبق سکھاتے مگر اپنے کمزور کردار کی بدولت وہ انگریزوں کی چال میں آگئے۔ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو ''معاہدۂ گندمک'' کے عنوان سے مشہور ہے اور جسے افغانستان میں ''دگندمک تڑون'' کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے میں امیر یعقوب خان نے ذلت آمیز شرائط پر صلح کی۔ اس معاہدے کی جہاں دیگر شرائط ذلت آمیز تھیں وہاں یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ افغان حکومت اپنی خارجہ پالیسی حکومتِ برطانیہ کی خواہش اور تائید سے وضع کرے گی۔ انگریز ریذیڈنٹ کو مکمل حفاظتی انتظامات کے ساتھ شایانِ شان طریقے سے کابل میں رہنے کی اجازت دی جائے گی اور درۂ خیبر سے درۂ بولان تک کا علاقہ (جو آج کل پاکستان کا حصّہ ہے) مستقل طور حکومتِ برطانیہ کے حوالے کیا جائے گا۔ امیر یعقوب خان نے افغان روایات کو پاؤں تلے روندتے ہوئے ان ذلت آمیز شرائط کو قبول کیا۔ وہ قوم جس نے تین دہائی پہلے انگریزوں کو تاریخ ساز شکست دی تھی، اس کے لیے یہ معاہدہ شرمناک تھا۔ لہٰذا پشتون قبائل امیر یعقوب خان کے معاہدے سے سخت نالاں ہو گئے اور چالیس دن بھی نہیں گزرے تھے کہ افغان عوام نے دستیاب بندوقوں، تلواروں اور لاٹھیوں سے برطانوی ریذیڈنسی پر حملہ کیا اور ریذیڈنٹ اور اس کی حفاظت پر مامور افغان حفاظتی اہلکاروں کو قتل کرتے ہوئے ریذیڈنسی کو آگ لگائی۔ اس وقت افغانستان میں صرف کرم ایجنسی میں جنرل رابرٹس کچھ برطانوی، سکھ اور شیعہ ملیشیا کے ساتھ موجود تھا، اس نے جنگ کا آغاز کیا اور دوسری افغان اینگلو جنگ شروع ہوئی۔ جنرل رابرٹس نے ریذیڈنسی پر حملے کے مرتکب تقریباً ستاسی افراد کو پھانسی دی اور امیر یعقوب خان کو اس جرم میں برطرف کر دیا۔

یعقوب خان کے بعد امیر عبد الرحمٰن خان افغانستان کے نئے بادشاہ تسلیم کیے گئے۔ امیر عبد الرحمٰن خان کے برسرِ

اقتدار آتے ہی نادر خان کے دادا سردار یحییٰ خان اپنے خاندان سمیت ملک سے باہر چلے گئے، وہیں پر نادر خان اور ان کے بھائیوں کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ نادر خان اپنے بھائیوں میں ایک باوقار، باصلاحیت اور سنجیدہ فکر کی حامل شخصیت تھے۔ امیر عبدالرحمٰن خان کی وفات کے بعد جب امیر حبیب اللہ خان تختِ کابل پر متمکّن ہوئے تو ۱۹۰۱ء میں نادر خان کے دادا اور والد اپنے خاندان سمیت واپس کابل آئے۔ امیر حبیب اللہ خان نے نادر خان کے والد یوسف خان اور چچا آصف خان کو اپنے مصاحبین میں شامل کیا۔ ۱۹۰۸ء میں نادر خان جنرل بن گئے اور ملک کے مختلف حصوں میں اندرونی بغاوتوں کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھیں خدمات کی بدولت ۱۹۱۱ء میں نائب سپہ سالار منتخب کیے گئے۔ جبکہ ۱۹۱۲ء میں سپہ سالار کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ جب ۱۹۱۹ء میں امان اللہ خان برسرِ اقتدار آئے تو شروع کے ایام میں نادر خان کو اپنے عہدے سے برطرف کیا گیا مگر پھر بہت جلد انھیں دوبارہ اہم مقام دیا گیا اور انگریزوں کے خلاف جنگِ استقلال میں نادر خان نے بڑی خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کے اعتراف میں نادر خان کو وزیرِ دفاع بنا دیا گیا۔ مگر ۱۹۲۲ء میں بعض خاندانی اختلافات اور امان اللہ خان کی بعض پالیسیوں سے نالاں ہو کر نادر خان نے استعفا دیا۔ استعفا دینے کے بعد نادر خان ملک سے باہر چلے گئے اور اس وقت واپس آئے جب ۱۹۲۹ء میں بچہ سقّہ نے کابل پر قبضہ کر کے امان اللہ خان کو کابل سے نکال دیا تھا۔ نادر خان نے شروع میں امان اللہ خان کو اپنی خدمات پیش کیں مگر امان اللہ خان ملک سے باہر چلے گئے اور افغانستان کو بچہ سقّہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ یہ وقت تھا کہ نادر خان کی فوج نے ملک کے مختلف علاقوں پر کنٹرول حاصل کرتے ہوئے کابل کو گھیر لیا اور بچہ سقّہ کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ افغانستان میں امن قائم کیا اور بچہ سقّہ اور دیگر فسادیوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ پھر افغانستان کے عوام کی حمایت سے نادر خان کو جرگے نے اپنا نیا حکمران چُن لیا اور انھوں نے افغانستان کی تعمیر و ترقی کے لیے اہم اقدامات کیے، مگر بدقسمتی سے محض چند سال بعد ۱۹۳۳ء میں انھیں ایک سرکاری تقریب کے موقعے پر شہید کر دیا گیا اور ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محمد ظاہر شاہ افغانستان کے حکمران منتخب کیے گئے۔ نادر شاہ افغانستان کے وہ حکمران ہیں جن سے علامہ اقبال کو بڑی عقیدت تھی اور وہ بھی اقبال کے علم و فضل کے معترف تھے۔

یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ نے علامہ اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی اور سر سید کے پوتے سر راس مسعود کو

افغانستان کے تعلیمی امور کے سلسلے میں مشاورت کے لیے کابل کے دورے کی دعوت دی اور وہ تینوں حضرات وفد کی شکل میں وہاں گئے۔ چنانچہ اس کے متعلق حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا:

نادرِ افغاں شہ درویش خو　　رحمتِ حق بر روان پاک او
کارِ ملت محکم از تدبیر او　　حافظِ دینِ مبین شمشیرِ او
چوں ابوذر خود گداز اندر نماز　　ضربتش ہنگام کیں خارا گداز
عہدِ صدیق از جمالش تازہ شد　　عہدِ فاروق از جلالش تازہ شد

”نادر شاہ درویش صفت انسان تھے، اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں ہوں ان پر۔ ان کی تدابیر کی وجہ سے ملت کے کاموں میں استحکام پیدا ہوا تھا اور ان کی شمشیر دینِ مبین کی محافظ تھی۔ نادر شاہ کی نماز میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی طرح سوز و گُداز محسوس ہوتا تھا اور جب دشمن کے ساتھ مقابلے کی نوبت آتی تو ان کی شمشیر کی ضرب پتھروں کو بھی توڑ دیتی تھی۔ اس بادشاہ کی حکمرانی کے حسین و جمیل انداز و اطوار سے عہدِ صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے جلال اور دبدبے سے عہدِ فاروق رضی اللہ عنہ کی یادیں تازہ ہو گئیں“۔ (اس وفد کی روداد اور علامہ اقبال مرحوم کے افغانستان سے متعلق کلام کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی)

نادر خان کے بعد ان کے بیٹے محمد ظاہر شاہ نے چالیس سال حکومت کی اور بالآخر سردار محمد داؤد نے ان کا تختہ الٹ دیا اور شہنشاہیت ختم کر کے جمہوریت کی بنا ڈالی۔ لہٰذا محمد ظاہر شاہ افغانستان کے آخری بادشاہ ثابت ہوئے۔ واضح رہے کہ سردار داؤد خان، ظاہر شاہ کے چچا یعنی نادر شاہ کے بھائی سردار عزیز کے بیٹے تھے، گویا وہ ظاہر شاہ کے چچازاد تھے۔ سردار عزیز جرمنی میں سفیر تھے اور وہیں پر انھیں قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح سردار محمد داؤد کی اہلیہ زینب ظاہر شاہ کی بہن تھیں۔ محمد داؤد خان نے اپنے چچازاد بھائی محمد ظاہر شاہ کو تخت سے محروم کر کے خود اس پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد محمد داؤد خان پانچ برس اقتدار میں رہ کر اپریل ۱۹۷۸ء کو کابل میں انقلاب کے نتیجے میں اپنے اہلِ خانہ سمیت قتل کر دیے گئے۔ سردار داؤد کے قتل کے بعد فوجی بغاوت کے نتیجے میں کمیونسٹ حکومت وجود میں آئی اور نور محمد ترہ کئی افغانستان کے صدر بن گئے۔ جو

۱۹۷۹ء تک افغانستان کے صدر رہے۔ نور محمد ترکئی بہت جلد قتل کر دیے گئے اور اس کے بعد حفیظ اللہ امینؔ اقتدار پر قابض ہوگئے، مگر وہ محض تین ماہ صدر رہے۔ حفیظ اللہ امینؔ کے بعد ببرک کارمل اقتدار میں آئے جو ۱۹۸۶ء تک برقرار رہے۔ ببرک کارمل کے بعد ڈاکٹر محمد نجیب اللہ آئے جو ۱۹۹۲ء تک افغانستان کے صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۹۶ء میں طالبان کی طرف سے امارتِ اسلامیہ کے قیام اور فتحِ کابل کے موقعے پر انھیں راستے سے ہٹا دیا گیا۔

جب انقلاب کے نتیجے میں ملک کے حالات کشیدہ ہوئے اور کمیونسٹ حکومت کے خلاف افغان عوام نے مزاحمت شروع کی تو کمیونسٹ حکومت کی دعوت پر اس کی مدد کے لیے ۱۹۷۹ء میں سویت یونین نے باقاعدہ افغانستان پر حملہ کر دیا۔ افغان قوم نے سویت یونین کی مخالفت کی کیونکہ سویت یونین نے کمیونزم کا نفاذ کیا اور ظاہر ہے یہ نظام اسلامی تعلیمات اور افغان روایات کے خلاف تھا۔ لہٰذا سویت یونین کی جارحیت کے مقابلے میں کئی افغان جہادی تنظیموں نے جہاد کا آغاز کیا۔ اس جنگ میں افغانستان کے مجاہدین کے ساتھ پڑوسی ممالک اور بین الاقوامی طاقتیں بھی شامل ہوگئیں۔ بین الاقوامی طاقتوں نے سرد جنگ میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے زور آزمائی کی اور بالآخر ایک طویل جنگ کے بعد ۱۹۸۸ء میں جنیوا معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں روس نے افغانستان سے ۱۹۸۹ء میں اپنی فوجیں نکال لیں اور افغانستان میں ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت برقرار رہی۔ تاہم ڈاکٹر نجیب اللہ کو بدستور روس کی حمایت حاصل تھی اس لیے جہادی تنظیموں نے اپنی تحریکی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ۱۹۹۲ء میں احمد شاہ مسعود اور جنرل عبدالرشید دوستم نے کابل پر قبضہ کرلیا۔ چونکہ روس کے نکلنے کے بعد جہادی تنظیموں کے درمیان تشکیلِ حکومت کے لیے باقاعدہ ایک اصولی معاہدہ وجود نہیں رکھتا تھا اس لیے جہاد میں حصہ لینے والے مختلف گروہوں کے مابین خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس خانہ جنگی کو روکنے کے لیے صبغت اللہ مجددیؔ کی صدارت میں اسلامی جہادی کونسل تشکیل دی گئی۔ صبغت اللہ مجددیؔ کے بعد اس کونسل کے صدر برہان الدین ربانیؔ بن گئے اور کابل میں ڈاکٹر نجیب اللہ کے متوازی ایک حکومت بنائی گئی جس میں برہان الدین ربانیؔ صدر اور گلبدین حکمت یار وزیرِ اعظم بنائے گئے۔ مگر اس کا خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا اس لیے کہ ایک ملک میں دو متوازی حکومتوں نے مسائل میں اضافہ کر دیا اور مزید خانہ جنگی شروع ہوئی، افغان عوام کی زندگی اجیرن ہوگئی، ہر طرف مظالم کی داستانیں رقم ہوئیں۔ چونکہ افغان

عوام جہاد میں بے پناہ قربانیوں کے بعد اپنے ملک میں امن چاہتے تھے جبکہ جہادی تنظیمیں امن کے قیام میں ناکام رہیں۔ ایسے میں اس خلا کو پر کرنے اور افغانستان میں امن کے قیام کے لیے ملا محمد عمر مجاہد کی قیادت میں مقامی سطح پر قندھار میں مدارس کے طلبہ کی ایک تحریک کا آغاز ہوا، جس کا مقصد صرف ایک خاص علاقے میں امن کا قیام تھا۔ مگر جب ظلم کے مارے مظلوم افغانیوں نے ملا محمد عمر مجاہد کی کامیاب پالیسی کا مشاہدہ کیا تو ہر طرف سے انھیں دعوت دی گئی اور خوش آمدید کہا گیا۔ یوں ایک خاص علاقے سے نکل کر پورے افغانستان میں تحریکِ طالبان کے نام سے ایک تحریک منظم ہوئی جس نے بالآخر پچانوے فیصد افغانستان میں ایک پرامن اسلامی حکومت تشکیل دی اور ملا محمد عمر کو امیر المؤمنین تسلیم کر لیا۔ طالبان کی یہ حکومت ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۱ء تک قائم رہی اور اس حکومت نے امن بحال کیا، منشیات کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ طالبان کے دورِ حکومت میں گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے شہر نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حیران کن طور پر ایک حملہ ہوا اور اسے مکمل تباہ کر کے رکھ دیا، جس میں سینکڑوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ امریکہ نے اس کا الزام اسامہ بن لادن اور ان کی تنظیم القاعدہ پر عائد کیا جو ان دنوں افغانستان میں پناہ لیے ہوئے تھے اور طالبان حکومت سے ان کی فی الفور حوالگی کا مطالبہ کیا۔ طالبان حکومت نے اپنے ملک میں امریکہ کو اس واقعے کی تحقیق کی پیشکش کی اور اس میں ملوث کرداروں کو عدالت کے ذریعے سزا دلوانے کا وعدہ کیا جو بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں بالکل صائب فیصلہ تھا۔ مگر امریکہ بدمعاش نے اپنے چالیس اتحادیوں کے ہمراہ بین الاقوامی برادری کی تمام روایات کو پاؤں کے نیچے روندتے ہوئے انتہائی رعونت کے ساتھ سات اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ امریکہ کی سرپرستی میں افغانستان میں حامد کرزئی کو صدر بنایا گیا جو ۲۰۰۲ء سے ۲۰۱۴ء تک صدر رہے۔ اس کے بعد محمد اشرف غنی صدر بنے جو ۲۰۲۱ء میں طالبان کی واپسی تک صدر کے عہدے پر برقرار رہے۔

ان بیس سالوں کے دوران امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے مظلوم افغانیوں کے گھربار اُجاڑے اور معصوم بچوں، عورتوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ افغانیوں نے اپنی روایت کے مطابق امریکہ کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ دو دہائیوں سے جاری اس جنگ میں بے پناہ تباہی ہوئی اور ہزاروں جانیں لقمۂ اجل بن گئیں۔ بالآخر امریکہ اور طالبان کے درمیان ۲۰۲۰ء

میں "دوحہ" قطر میں ایک معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں ۲۰۲۱ء میں امریکہ اور اس کی اتحادی افواج کا ذلت آمیز پسپائی کے ساتھ افغانستان سے مکمل انخلا ہوا۔ افغان سیکیورٹی فورسز نے طالبان سے جنگ کرنے کے بجائے رفتہ رفتہ ہتھیار ڈالنا شروع کر دیے اور افغانستان میں ایک بار پھر طالبان کی فرمان روائی تسلیم کی گئی۔

کتابیات

الكامل في التاريخ (لابن الأثير)

افغانستان د تاریخ په رڼا کی (استاد احمد علی کهزاد)
افغانستان د معاصر تاریخ په رڼا کی (شهسوار سنګر وال)
له احمد شاه بابا سره تر حامد کرزی
د افغانستان تاریخ له اصحابانو ترطالبانو(حانواک مفتی زاده)
د افغانستان پر معاصر تاریخ یوه لنډه کتنه (ډاکټر ابراهیم عطائی)

سیرِ افغانستان (مولانا سید سلیمان ندوی)

تاریخِ افغانستان (مولانا اسماعیل ریحان)

جاری ہے

*****